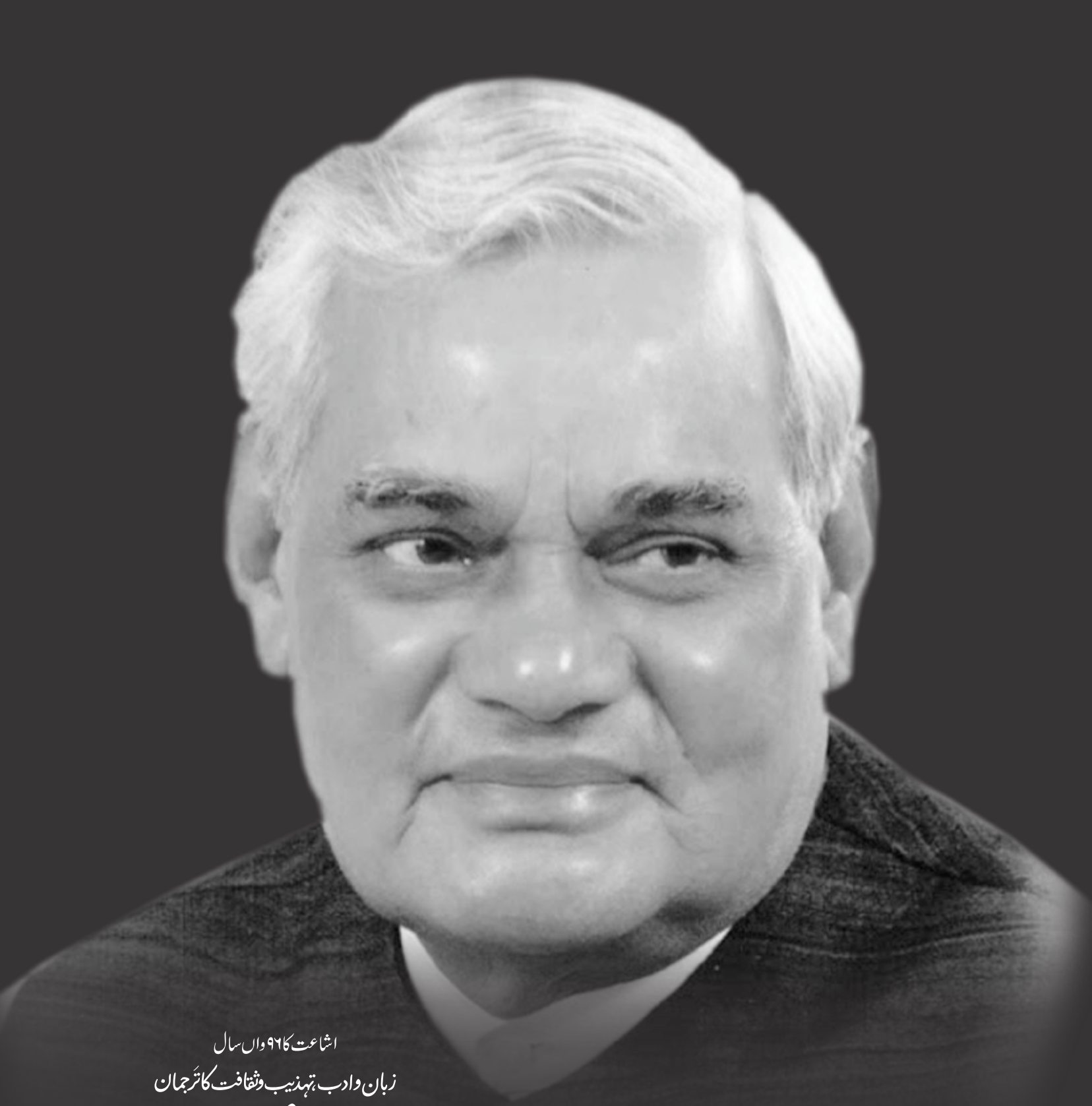

اشاعت کا ۹۶واں سال

زبان و ادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

اگست ۲۰۱۸ء

۱۵؍روپئے

محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش

کارگل کی جنگ کے دوران ملک کی مدد کی خاطر اپنے شوہر کی وفات کے بعد
محترمہ پئی نے سہاگ کے زیورات ملک کو سونپ دئے۔
انہیں زیورات کو اٹل بہاری واجپئی کو سونپتے ہوئے رام نائیک اور کریٹ سومیا۔

مہاراشٹر، گوا اور کیرل کو مربوط کرنے والے کونکڑ ریلوے کو
مہاراشٹر کے رتنا گری میں قوم کے نام معنون کرتے ہوئے اٹل بہاری واجپئی۔
ساتھ میں ہیں رام نائیک، سشما سوراج، جارج فرنانڈیز، پی سی الگزینڈر، گنیش کمار، منوہر جوشی

۹ مئی ۲۰۰۱ء کو اتر پردیش کے لونی (غازی آباد) میں دنیا کی سب سے طویل
(۱۲۷۰ کلومیٹر) اور ۱۲۳۰ کروڑ روپئے کی سرمایہ کاری سے تعمیر ہونے والی
گیل کی ایل پی جی گیس لائن کے افتتاح کے موقع پر جناب اٹل بہاری واجپئی، رام نائیک اور وشنو کانت شاستری

اٹل بہاری واجپئی نے کینسر کی بیماری میں مبتلا رام نائیک
سے ان کے گھر جا کر ملاقات کی۔ ساتھ میں ہیں اہلیہ رام نائیک محترمہ کندا نائیک
اور ان کی بیٹیاں، وشاکھا اور ڈاکٹر نشی گندھا

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی گورکھپور میں
دریائے راپتی میں سابق وزیر اعظم آنجہانی اٹل بہاری کی استھیاں وسرجت کرتے ہوئے

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ گورکھپور میں
سابق وزیر اعظم آنجہانی اٹل بہاری کے استھی کلش کے ساتھ

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی نئی دہلی میں
سابق وزیر اعظم آنجہانی اٹل بہاری واجپئی کے انتقال کے بعد ان کی رہائش گاہ پر ان کے سلسلہ میں
اپنی یادوں کے چند نقوش تحریر کرتے ہوئے، ساتھ میں ہیں گورنر اتر پردیش جناب رام نائیک

مرکزی وزیر داخلہ جناب راج ناتھ سنگھ، اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک،
وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی اور دیگر معززین جھولے لال پارک، لکھنؤ میں
سابق وزیر اعظم آنجہانی اٹل بہاری واجپئی کے 'استھی وسرجن' کے موقع پر

جلد : ۷۳ شمارہ : ۴

ماہنامہ **نیا دور** لکھنؤ

اگست ۲۰۱۸ء

پبلشر: ڈاکٹر اجوّل کمار
ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

ایڈیٹر
سہیل وحید

فون: 9415007694
Ph. No. 2239132 Ext. 228
Email: nayadaurmonthly@gmail.com

رابطہ برائے سرکولیشن وزرِ سالانہ
صبا عرفی
فون: 7705800953

تزئین کار : وقار حسین

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج لکھنؤ
شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش

زرِ سالانہ: ۱۶۵/روپے

ترسیل زر کا پتہ
ڈائرکٹر
انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
پارک روڈ، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

Please send Cheque/Bank Draft in favour of Directer, Information & Public Relations Department, UP, Lucknow

خط وکتابت کا پتہ
ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱
بذریعۂ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ
ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
۶ پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

اس شمارے میں...

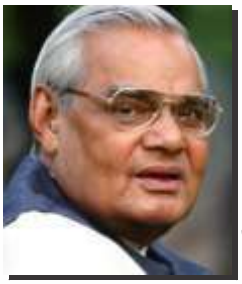

۱	موت سے ٹھن گئی	۴
۲	نظمیں	۵
۳	کویتا مجھے گھٹّی میں ملی تھی	۱۰
۴	لکھنؤ کی رگ رگ میں	۱۲
۵	اقوام متحدہ میں ہندی میں خطبہ	۱۳

یوم آزادی	جلیاں والا باغ کی ایک چشم دید گواہ رتن بائی	پی پی شرا ایستورند	۱۴
اداریہ، اپنی بات	وسیع ہوتے اردو کے حلقے	ایڈیٹر	۲
مضامین	اردو ناول کے فروغ میں غیر مسلم قلمکاروں کا حصہ	نعمان قیصر	۲۲
	اردو کے غیر مسلم شعراء کی شاعری میں اسلامی تاثرات	رضیہ پروین	۲۹
	اردو شعر وادب کے فروغ میں لکھنؤ کے غیر مسلم شعراء کا کردار	اسرار الحق	۳۲
	فارسی تاریخ نویسی میں غیر مسلم مصنفین کا حصہ	سعدیہ جعفری	۳۶
	تصوف اور ہندوستانی روحانیت	ڈاکٹر نریش	۳۸
	اردو شاعری میں پروازِ تخیل کے زاویے	کرشن بھاؤک	۴۱
افسانے	خوبصورت پل	رتن سنگھ	۵۹
	تہذیب کا تسلط	دیپک بدکی	۶۱
	لاگی چھوٹے نا	رینو بہل	۶۵
	جاگتی آنکھوں کا سراب	اویناش امن	۶۹
	حوادث غائبانہ	راجیو پرکاش ساحر	۷۳
گزشتہ لکھنؤ	پسماندہ طبقہ کا طرزِ زندگی	مرزا جعفر حسین	۸۱
ہندی کہانی	باپ بیٹی	نرملا بھراڑیا	۸۴
غیر ملکی ادب	درزی	جان گالزوردی	۸۷
ہندوستانی زبانیں	مہانگری	راجندر مشر	۹۰
گل افشانیاں	بریک لینے کی روایت	ملئے جین	۹۳

غزلیں ونظمیں	گلزار	۱۶	گلزار دہلوی ۱۸
	جینت پرمار	۱۹	چندر بھان خیال ۲۰
	گلشن بریلوی	۲۱	دیپک دانش ۵۴
	سنجئے مصر اشوق	۵۵	راکیش راہی ۵۶
	پونم کوشر	۵۷	نلنی وبھا نازلی ۵۸
	رام پرکاش بیخود، اجئے سحاب	۷۵	سیا سچدیو، ستیش شکلا رقیبؔ ۷۶
	اوم پرکاش ندیم، رمیش پانڈے شکھر	۷۷	خوشبیر سنگھ شادؔ، پرکھر مالویہ کانہا ۷۸
	نویش ساہو، وشال کھلر	۷۹	سیما کشی وشال شریواستو، منیش شکلا ۸۰

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

وسیع ہوتے اردو کے حلقے

اردو زبان کی تعریف وتوصیف میں کچھ بھی لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مانند ہے، یہ زبان اپنے حجم میں تاریخ کے ان حوادث کو سمیٹے ہوئے ہے جو کسی اور زبان کے خمیر کا حصہ نہیں بن پائے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں اردو کے نئے علم وادب کے حلقوں کی کہانی رقم ہوتی رہی ہے۔ جدید دور کی تکنیکی بازگشت اور نئے نئے آلات کی بھرمار بھی اردو کی توسیع کے لئے مفید ثابت ہورہی ہے۔ ان جدید آلات کی بدولت اردو ان علاقوں تک اپنی رسائی کرنے میں کامیاب رہی جہاں اردو کو دانستہ طور پر کبھی داخل نہیں ہونے دیا جاتا۔

ہم نے اپنے اعلان کے مطابق اردو کے وسیع ہوتے نئے حلقوں نیز اس زبان کے سیکولر کردار پر کچھ مواد شائع کرنے کا تہیہ کیا تھا۔ اس ضمن میں جب ہم نے قلمکار حضرات سے رجوع کیا تو یہ جان کر ہماری حیرت انتہا کو پہنچ گئی کہ اردو کو اپنی زبان بنانے اور سمجھنے والوں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہو چکا ہے۔ بے شمار شعراء ایسے پیدا ہو چکے ہیں جن کی تخلیقات ابھی تک منظر عام پر نہیں آئی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو گنگناتے رہتے ہیں اور غزلیں اپنے موبائل اور کمپیوٹر میں محفوظ کرتے رہتے ہیں۔ درجنوں ایسے کہانی کار ہیں جنہوں نے اردو میں کہانیاں لکھ کر رکھ چھوڑی ہیں اور انہیں چھپوانے کی کوئی خواہش بھی نہیں ہے۔ ان میں سے کئی لوگوں نے دورانِ گفتگو اس بات کا اعتراف کیا کہ اردو سے دلچسپی پیدا ہوئی تو ہمیں اپنے اندر تخلیق کے سوتے پھوٹنے کا احساس بھی ہوا جو اشعار اور افسانے کی شکل میں آج ہمارا اثاثہ بن چکا ہے۔ ان میں اکثر وہ لوگ ہیں جو کاغذ قلم کا استعمال نہیں کرتے، کی بورڈ اور اسکرین ہی ان کی تخلیقیت کا ضامن ہے اور انٹرنیٹ ان کا جامع وسیلہ۔

ہمارے روایتی اردو مراکز، یونیورسٹیاں اور ادارے ان تخلیق کاروں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے اور نہ ہی انہیں ان کے بارے میں علم ہے۔ ہمیں اس بات کا اعتراف پہلے بھی تھا اور ابھی بھی ہے کہ اردو کی کشش کے سحر سے نئی نسل کا بچ پانا ممکن نہیں ہے جس کی رسائی کا سب سے معتبر ذریعہ ہندوستانی فلموں کے نغمے اور مکالمے ہیں۔ انٹرنیٹ آنے کے بعد ترسیل کے اس عمل میں چہار جانب اضافہ ہوا ہے اور بے شمار لوگوں نے اردو کو بنا کسی کی مدد کے اپنا بنا لیا ہے۔ ان میں سے ہم نے خصوصاً ان

نیا دور فیس بک اور واٹس اپ پر بھی

نیا دور کے شمارے مئی ۲۰۱۷ء تا حال فیس بک اور واٹس اپ پر قارئین کے مطالعہ لئے پوسٹ کئے جارہے ہیں۔

لوگوں کا انتخاب کیا جنہوں نے باضابطہ طور پر اردو شعر وادب کا فنی پیرہن اوڑھ لیا۔ ان میں سے بھی ہم نے ان افراد کو اس شمارے کے لئے منتخب کیا جن کا تعلق اردو معاشرہ سے نہیں رہا ہے۔ ہم نے دانستہ طور پر یہ پورا شمارہ ایسے ہی لوگوں کو معنون کر دیا ہے۔ ہمیں بھروسہ ہے قارئین 'نیا دور' کو ادارہ کی یہ سعی راس آئے گی۔ مقصد صرف یہ ہے کہ اردو کے لکھنے پڑھنے والوں میں ایسے لا تعداد لوگ موجود ہیں جنہیں اردو شاید ہم سے زیادہ پیاری ہے۔

اس شمارے میں ۳۴ غیر مسلم تخلیق کاروں کو شامل کیا گیا ہے اور سات ایسے مضامین بھی شامل ہیں جن میں غیر مسلم شعراء وادباء کی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ہمیں یہ بتاتے ہوئے بیحد مسرت ہو رہی ہے کہ ہم ۳۴ لوگوں کو شامل کرنے کے باوجود اس سے دوگنا سے زیادہ اردو کے غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات شائع کرنے سے قاصر رہے کیونکہ ان سب کی تخلیقات کو حاصل کرنے کے لئے کافی وقت لگ جاتا اور یہ شمارہ پھر نہ جانے کب شائع ہو پاتا۔ آئندہ مزید ایک کوشش کریں گے کہ ہندوستان بھر کے غیر مسلم اردو ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کو یکجا

جون ۲۰۱۸ء سے 'نیا دور' کی قیمت ۱۵/روپے فی شمارہ متعین کرنے کے ساتھ زرِ سالانہ ۱۶۵/روپے طے کیا گیا ہے

کر کے 'نیا دور' کے ایک شمارے کی زینت بنایا جائے۔

ہمیں یقین ہی نہیں ہوا جب گلزار صاحب نے اس شمارے کے لئے اپنی نظمیں ہمیں بھیج دیں۔ یہ 'نیا دور' کے لئے ان کا گرانقدر تحفہ ہے۔ بلا مبالغہ گلزار ہمارے عہد کے مقبول ترین ایسے شاعر ہیں جن کے ڈکشن اور نغمگی کا ہر کوئی قائل ہے۔ ان کے گیتوں کے پرستاروں کی تعداد کروڑوں میں ہیں۔ ان کے مکالمے خالص اردو میں ہوتے ہیں جن کی پسندیدگی کا اظہار کئے بنا شاید ہی کوئی رہ پاتا ہو۔ انہوں نے اردو کو دورِ جدید کی ہندوستانی فلموں میں فخریہ طور پر استعمال کیا ہے۔ ادارہ 'نیا دور' ان کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ بزرگ شاعر گلزار دہلوی، گلشن بریلوی، جینت پرمار، چندر بھان خیال کا بھی شکریہ جنہوں نے ہماری درخواست پر اپنی تخلیقات ادارہ 'نیا دور' کے لئے ارسال کیں۔ رتن سنگھ صاحب نے اس شمارے کے لئے خاص طور پر ایک کہانی تخلیق کر ارسال کی۔ ان کا بھی بہت بہت شکریہ۔ سنجئے مصرا شوق کا بھی شکریہ جنہوں نے اس شمارے کے لئے کافی مشقت کی۔ باقی تمام حضرات کا بھی شکریہ جنہوں نے اس شمارے کے لئے اپنی تخلیقات سے ہمیں نوازا۔ ہم ایک مرتبہ پھر ان سب حضرات کے شکرگزار ہیں جنہوں نے اس شمارے کی تیاری میں ہماری حوصلہ افزائی کی۔

ہندوستان کے ۷۲ ویں یوم آزادی کے موقع پر ادارہ 'نیا دور' کی جانب سے اپنے تمام قارئین کو مبارکباد۔

یہ شمارہ پریس میں جا ہی رہا تھا کہ سابق وزیر اعظم بھارت رتن اٹل بہاری واجپئی جی کے انتقال کی خبر آ گئی۔ اس ناگہانی کے لئے ملک تیار نہیں تھا۔ اس افسوسناک خبر سے پورا ملک غم میں ڈوب گیا اور ہر طرف رنج والم کا ماحول بن گیا۔ ان کے بے شمار شائقین اور رفقاء رنجیدہ ہو گئے۔ دانشوروں کے بہت بڑے حلقے نے بھی واجپئی جی کے انتقال کو ملک کے لئے خسارہ قرار دیا کہ یہ خلا کبھی پُر نہیں ہوسکتا۔ آنجہانی اٹل بہاری واجپئی سیاسی رہنما تو تھے ہی لیکن بنیادی طور پر شاعر تھے۔ ان کی کویتاؤں کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی متعدد کویتاؤں کو لتا منگیشکر اور جگجیت سنگھ جیسے مایۂ ناز گلوکاروں نے اپنی آواز دی۔

ادارہ 'نیا دور' ان کو بھرپور خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک خصوصی گوشہ اس شمارے میں شائع کر رہا ہے۔

ادارہ 'نیا دور' جون کے شمارے میں ایک سہو کی اشاعت کے لئے قارئین سے معذرت خواہ ہے۔ 'نیا دور' کے شمارے مئی ۲۰۱۷ء تا حال ww.information.up.nic.in پر ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔

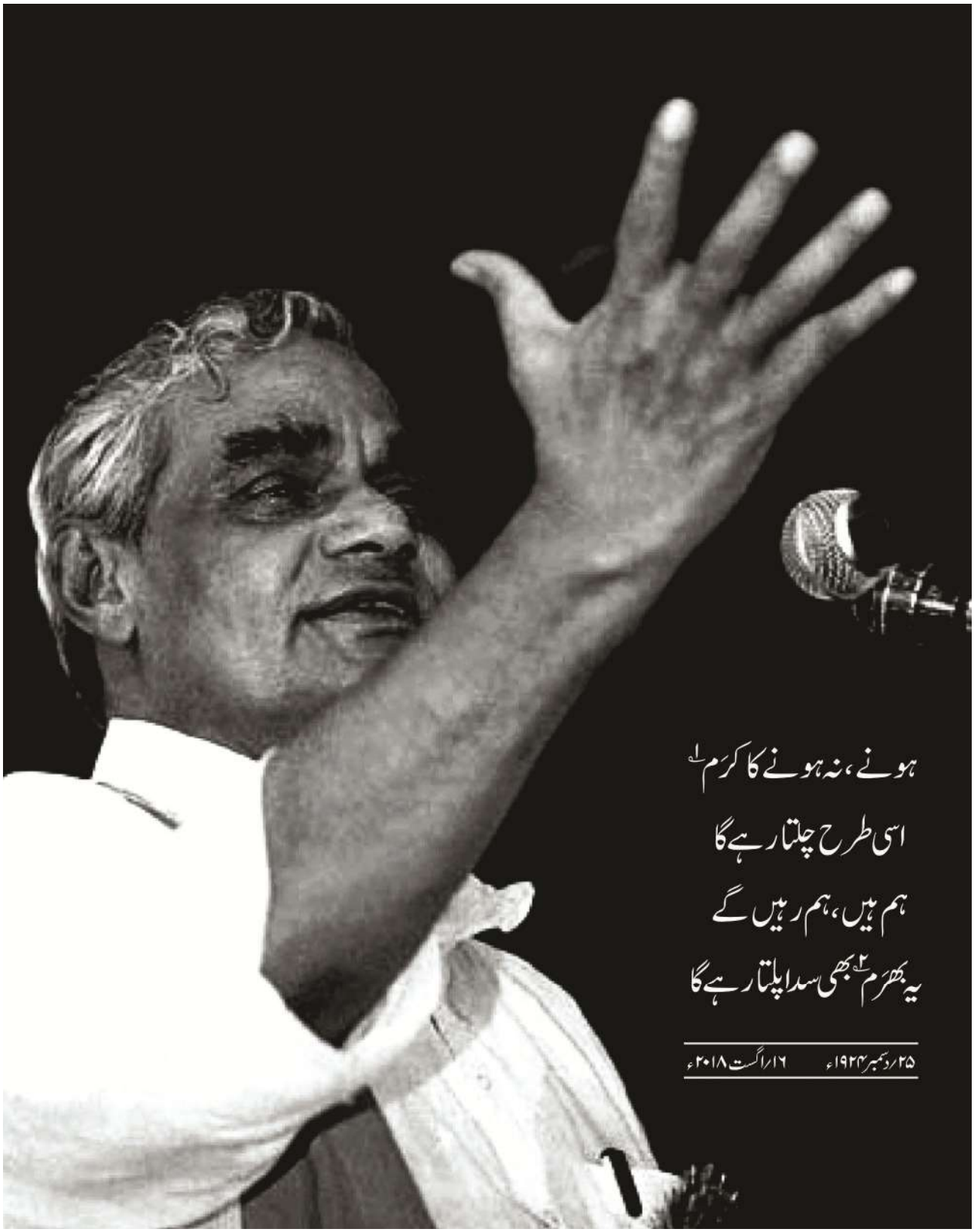
ہونے، نہ ہونے کا کرَم[1]
اسی طرح چلتا رہے گا
ہم ہیں، ہم رہیں گے
یہ بھرَم[2] بھی سدا پلتا رہے گا
۲۵/دسمبر ۱۹۲۴ء
۱۶/اگست ۲۰۱۸ء

۱۔ کرم ۲۔ بھرم

موت سے ٹھن گئی...!!!

ٹھن گئی
موت سے ٹھن گئی
جوجھنے کا میرا ارادہ نہ تھا
موڑ پر ملیں گے اس کا وعدہ نہ تھا
راستہ روک کر وہ کھڑی ہوگئی
یوں لگا زندگی سے بڑی ہوگئی
موت کی عمر کیا ہے؟ دو پل بھی نہیں
زندگی سلسلہ آج کل کی نہیں
میں جی بھر جیا، میں من سے مروں
لوٹ کر آؤں گا کوچ سے کیوں ڈروں؟
سامنے وار کر پھر مجھے آزما
تو دبے پاؤں چوری چھپے سے نہ آ
سامنے وار کر پھر مجھے آزما
موت سے بے خبر زندگی کا سفر
شام ہر سُرمئی، رات بنسی کا سوَر (1)
بات ایسی نہیں کہ کوئی غم ہی نہیں
درد اپنے پرائے سے کچھ کم نہیں
پیار اتنا پرایوں سے مجھ کو ملا
نہ اپنوں سے باقی ہے کوئی گلہ
ہر چنوتی (2) سے دو ہاتھ میں نے کئے
آندھیوں میں جلائے ہیں بجھتے دیئے
آج جھکجھورتا تیز طوفان ہے
ناؤ بھنوروں کی بانہوں میں مہمان ہے
پار پانے کا قائم مگر حوصلہ
دیکھ طوفاں کا تیور، تیوری تن گئی
موت سے ٹھن گئی...!!!

---

(1) دھن، آواز (2) امتحان،

دودھ میں دراڑ پڑ گئی

خون کیوں سفید ہو گیا
بھید (1) میں اُبھید (2) کھو گیا
بٹ گئے شہید، گیت کٹ گئے
کلیجے میں کٹار گڑ گئی
دودھ میں دراڑ پڑ گئی
کھیتوں میں بارودی گندھ
ٹوٹ گئے نانک کے چھند
ستلج سہم اٹھی، وَیتھت (3) سی وَتستا (4) ہے
بسنت میں بہار جھڑ گئی
دودھ میں دراڑ پڑ گئی
اپنی ہی چھایا سے بیر
گلے لگنے لگے ہیں غیر
خودکشی کا راستہ، تمہیں وطن کا واسطہ
بات بنائیں بگڑ گئی
دودھ میں دراڑ پڑ گئی

---

(1) تقسیم، بٹا ہوا (2) یکجہتی، آپسی اتحاد
(3) غمزدہ (4) کشمیر کی ایک ندی کا نام

آؤ پھر سے دیا جلائیں

بھری دوپہری میں اندھیارا
سورج پرچھائیں سے ہارا
انترتم (1) کا نیہ (2) نچوڑیں بجھی ہوئی باتی سلگائیں
آؤ پھر سے دیا جلائیں
ہم پڑاؤ کو سمجھے منزل
لکچھ (3) ہوا آنکھوں سے اوجھل
ورتمان کے موہ جال میں آنے والا کل نہ بھلائیں
آؤ پھر سے دیا جلائیں
آہوتی (4) باقی یگیہ (5) ادھورا
اپنوں کے وِگھنوں (6) نے گھیرا
انتم جے (7) کا وجر (8) بنانے نو ددھیچی (8) ہڈیاں گلائیں
آؤ پھر سے دیا جلائیں

---

(1) باطن (2) خلوص (3) ہدف (4) ایثار
(6) سازش (7) فتح کا آخری پرچم (8) اسلحہ
(۹) مہان رشی کا نام

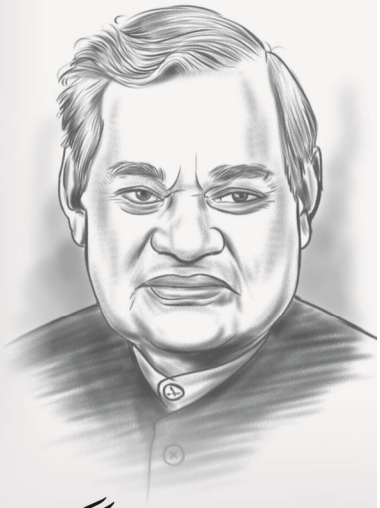

میں سوچنے لگتا ہوں

تیز رفتار سے دوڑتی بسیں
بسوں کے پیچھے بھاگتے لوگ
بچے سنبھالتی عورتیں
سڑکوں پر اتنی دھول اڑتی ہے
کہ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا
میں سوچنے لگتا ہوں
پُرکھے سوچنے کے لئے آنکھیں بند کرتے تھے
میں آنکھیں بند ہونے پر سوچتا ہوں
بسیں ٹھکانے پر کیوں نہیں ٹھہرتیں
لوگ لائن میں کیوں نہیں لگتے
آخر یہ بھاگ دوڑ کب تک چلے گی
دیش کی راجدھانی میں
سنسد کے سامنے
دھول کب تک اڑے گی
میری آنکھیں بند ہیں
مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا
میں سوچنے لگتا ہوں

نئی گانٹھ لگتی ہے

جیون کی ڈور چھور چھونے کو مچلی
جاڑے کی دھوپ سوُرن کلشوں (1) سے پھسلی
اَنتر کی اَمرائی
سونی پڑی شہنائی
ایک دبے درد کی سَہسا (2) ہی جگتی
نئی گانٹھ لگتی
دور نہیں پاس نہیں منزل انجانی
سانسوں کے سرگم پر چلنے کی ٹھانی
پانی پر لکیر سی
کھلی زنجیر سی
کوئی مرگ ترِشنا (3) مجھے بار بار چھلتی
نئی گانٹھ لگتی
من میں لگی جو گانٹھ مشکل سے کھلتی
داغ دار زندگی نہ گھاٹوں پر دھلتی
جیسی کی تیسی نہیں
جیسی ہے ویسی نہیں
گبھیرا کی چدریا بڑے بھاگ ملتی
نئی گانٹھ لگتی

---

(1) سونے کا گھڑا (2) اچانک
(3) سراب، دھوکا

جیون بیت چلا

کل کل کرتے آج
ہاتھ سے نکلے سارے
بھوت(1) بھوشیہ(2) کی چنتا میں
ورتمان(3) کی بازی ہارے
پہرا کوئی کام نہ آیا
رَس(4) گھٹ رِیت(5) چلا
جیون بیت چلا

بانی لابھ(6) کے پلڑوں میں
تُلتا جیون ویاپار ہوگیا
مول لگا بکنے والے
بنا بکا بیکار ہوگیا
مجھے باٹ میں چھوڑا اکیلا
ایک ایک کر میت چلا
جیون بیت چلا

(1) ماضی (2) مستقبل
(3) دورِ حاضر (4) رس کا گھڑا
(5) خالی (6) نفع ونقصان

گیت نہیں گاتا ہوں

بے نقاب چہرے ہیں
داغ بڑے گہرے ہیں
ٹوٹتا طلسم، آج سچ سے بھئے(1) کھاتا ہوں
گیت نہیں گاتا ہوں

لگی کچھ ایسی نظر
بکھرا شیشے سا شہر
اپنوں کے میلے میں میت(2) نہیں پاتا ہوں
گیت نہیں گاتا ہوں

پیٹھ میں چھری سا چاند
راہو(3) گیا ریکھا پھاند
مکتی(4) کے کشنوں(5) میں بار بار بندھ جاتا ہوں
گیت نہیں گاتا ہوں

(1) خوف (2) دوست
(3) اک آفاقی راکشس جو چاند کو ڈھک لیتا ہے
(4) آزادی (5) لمحات

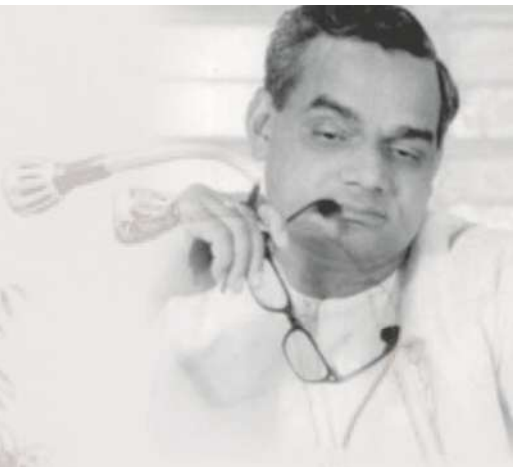

راہ کون سی جاؤں میں

چورا ہے پر لٹتا چیر (1)
پیادے سے پٹ گیا وزیر
چلوں آخری چال کہ بازی چھوڑ وِرکیتی (2) رچاؤں میں
راہ کون سی جاؤں میں؟

سپنا جنما اور مر گیا
مدھو رِتو (3) میں ہی باغ جھڑ گیا
تنکے بکھرے ہوئے بٹوروں یا نَو سرشٹی (4) سجاؤں میں
راہ کون سی جاؤں میں؟

دو دن ملے ادھار میں
گھاٹے کے دیا پار میں
چھن چھن کا حساب جوڑوں یا پونجی شیش (5) لٹاؤں میں
راہ کون سی جاؤں میں؟

---

(1) کپڑا
(2) دنیا سے لگاؤ نہ ہونا
(3) موسم بہار
(4) نئی کائنات
(5) باقی

موڑ پر

مجھے دور کا دکھائی دیتا ہے
میں دیوار پر لکھا پڑھ سکتا ہوں
مگر ہاتھ کی ریکھائیں نہیں پڑھ پاتا
سیما کے پار بھڑکتے شعلے
مجھے دکھائی دیتے ہیں
پر پاؤں کے ارد گرد پھیلی گرم راکھ
نظر نہیں آتی
کیا میں بوڑھا ہو چلا ہوں؟
ہر پچیس دسمبر کو
زینے کی اک نئی سیڑھی چڑھتا ہوں
نئے موڑ پر
اوروں سے کم سوئم سے زیادہ لڑتا ہوں
میں بھیڑ کو چپ کرا دیتا ہوں
مگر اپنے کو جواب نہیں دے پاتا
میرا من مجھے اپنی ہی عدالت میں کھڑا کر
جب جرح کرتا ہے
میرا حلف نامہ میرے ہی خلاف پیش کرتا ہے
تو میں مقدمہ ہار جاتا ہوں
اپنی ہی نظر میں گنہگار بن جاتا ہوں
تب مجھے دکھائی نہیں دیتا
نہ دور کا نہ پاس کا
میری عمر اچانک دس سال بڑھ جاتی ہے
میں سچ مچ بوڑھا ہو جاتا ہوں

اپنے ہی من سے کچھ بولیں

کیا کھویا کیا پایا جگ میں
ملتے اور بچھڑتے من میں
مجھے کسی سے نہیں شکایت
یدہی (1) چھلا گیا پگ پگ میں
ایک نظر ماضی پر ڈالیں، یادوں کی پوٹلی ٹٹولیں

زمین لاکھوں برس پرانی
زندگی ایک اننت کہانی
پَرتن کی اپنی سیمائیں
یدہی سو شرطوں کی وانی
اتنا کافی ہے اَنتم دستک پر خود دروازہ کھولیں

جنم مَرن (2) کا اوِرت (3) پھیرا
جیون بنجاروں کا ڈیرا
آج یہاں کل کہاں کوچ ہے
کون جانتا کدھر سویرا
اندھیارا آکاش اسیمیت (4) پرانوں کے پنکھوں کو تولیں
اپنے ہی من سے کچھ بولیں

(1) گرچہ، تو بھی (2) موت وزیست
(3) لامتناہی سلسلہ (4) لامحدود

سپنا ٹوٹ گیا

ہاتھوں کی ہلدی ہے پیلی
پیروں کی مہندی کچھ گیلی
پلک جھپکنے سے پہلے ہی سپنا ٹوٹ گیا

دیپ بجھا یا رچی دیوالی
لیکن کٹی نہ ماوس کالی
وِیَرتھ (1) ہوا آواھن (2) سوَرن سویرا روٹھ گیا
سپنا ٹوٹ گیا

نیتی کی لیلا نیاری
سب کچھ سوابا کی تیاری
ابھی چلا دو قدم کارواں ساتھی چھوٹ گیا
سپنا ٹوٹ گیا

(1) بے معنی (2) پوجا

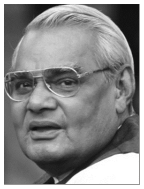

اٹل بہاری واجپئی

۱۹۲۴ء ۲۰۱۸ء

کویتا مجھے گھٹّی میں ملی تھی

میرے دادا سنسکرت زبان اور ادب کے اچھے عالم تھے۔ گھر کی ایک بیٹھک پرانے مخطوطات سے بھری ہوئی تھی۔ وہ جہاں جاتے، وہاں سے اچھی اچھی کتابیں ضرور خرید کر لاتے۔ جیوتش کا انہیں خاصہ علم تھا۔ دور دور سے لوگ انہیں اپنا زائچہ دکھانے کے لیے آتے تھے۔ ایک بار گاؤں کا ایک لڑکا اپنے والدین سے ناراض ہوکر گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ کہاں گیا کسی کو پتہ نہیں تھا؟ اس کے والد اس کا زائچہ لے کر میرے دادا کے پاس آ گئے۔ دادا نے ایک منتر کاغذ پر لکھ کر دیا، اور یہ ہدایت بھی دی کہ یہ منتر اس کے کسی کپڑے میں باندھ دیں، دو تین دن بعد وہ لڑکا سچ مچ اپنے گھر واپس آ گیا، تو گاؤں میں بڑی دھوم مچی۔ لیکن دادا کی دلچسپی جیوتش کے علم سے زیادہ ادب میں تھی۔

میرے والد شری کرشن بہاری واجپئی بٹیشور سے آ کر گوالیار میں آباد ہو گئے۔ انہوں نے بدلتے ہوئے وقت کو دیکھ کر انگریزی کی تعلیم شروع کی۔ کھڑی بولی کے ساتھ برج بھاشہ میں لکھی ان کی کویتائیں خاصی پسند کی گئیں۔ جب وہ بٹیشور سے گوالیار میں مقیم ہوئے تو انھیں ادب کا ایک بڑا حلقہ ملا۔ گولیار کی ریاست سے نکلنے والا ترجمان اخبار 'جیا جی پرتاپ' میں ان کی کویتائیں مستقل شائع ہوتی رہیں۔ جب یہ طے ہوا کہ گوالیار ریاست کا اپنا گیت ہونا چاہئے تو یہ کام والد صاحب کو سونپا گیا۔ گیت ایسا ہونا چاہئے تھا جس کی آسانی سے نغمہ سرائی ہو سکے۔ جس میں سندھیہ خاندان اور گوالیار کی شان و شوکت کی مدح سرائی لازمی تھی۔ والد صاحب کا قلم بند کیا گیا یہ گیت پوری ریاست میں مقبول ہونے کے ساتھ زباں زد عوام وخواص بھی ہوا۔ اسے باقاعدہ ریاست بھر میں گایا بھی جاتا تھا۔ اس کا ایک شعر مجھے ابھی تک یاد ہیں۔

ہم دیش ودیش کہیں بھی ہوں پر ہوگا تیرا دھیان سدا
تیرا ہی پتر کہانے میں ہوگا ہم کو ابھیمان سدا

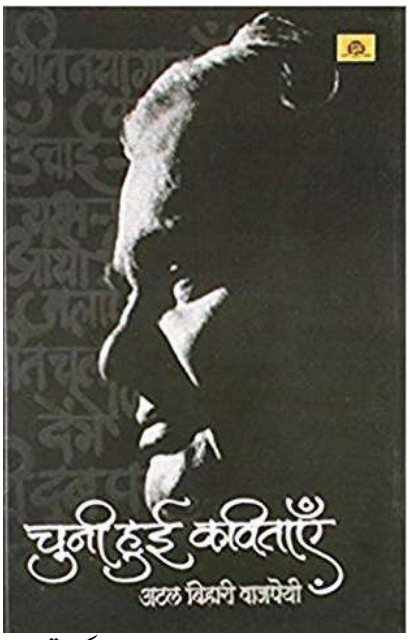

والد صاحب نے اور بھی کویتائیں لکھی تھیں۔ لیکن ان کی اشاعت پر توجہ نہیں دی، اس لیے وہ ضائع ہو گئیں۔ والد صاحب کی ہندی، انگریزی کے ساتھ اردو پر بھی خاصی دسترس تھی۔ ان دنوں طلبا کے لیے اردو لازمی تھی۔ ریاست میں ہر سال ہونے والے 'گنیش اتسو' میں میرے والد صاحب کی تقریر پابندی سے ہوتی تھی۔ اس سے ان کی ذہانت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، کہ وہ خود ہائی اسکول پاس ہوتے ہوئے بھی دسویں درجہ کے طالب علموں کو پڑھاتے تھے۔ بعد میں انہوں نے بی۔اے کا امتحان پاس کیا، اور ایم۔اے بھی، اسکول سے انسپکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد قانون کا مطالعہ کرنے کا عزم کیا۔ مجھے اس بات کا علم نہیں 25 دسمبر کے دن میری پیدائش کیوں ہوئی۔ بڑے ہونے پر مجھے یہ بتایا گیا کہ کہ 25 دسمبر کو عیسیٰ مسیح پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے اسے بڑے دن کی شکل میں منایا جاتا ہے۔ ساتھ میں مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ جب تم پیدا ہوئے تھے، تب پڑوس میں موجود چرچ میں عیسی مسیح کے یوم ولادت کا جشن منایا جارہا تھا، کیرول (عیسائیوں کی خاص دعا) گایا جارہا تھا، چاروں طرف خوشیوں کا ماحول تھا، اور بچوں میں مٹھائیاں تقسیم کی جارہی تھیں، بعد میں مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ ہندو دھرم کی عظیم شخصیت پنڈت مدن موہن مالویہ کی ولادت آج ہی کے دن ہوئی تھی، مجھے اپنی زندگی بھر اس بات پر فخر رہا ہے کہ میری ولادت ایسی عظیم شخصیات کے یوم پیدائش کے دن ہوئی۔

مجھے یہ بات ابھی تک اچھی طرح سے یاد ہے، کہ میرے والد شری کرشن بہاری واجپئی میرے انگلی پکڑ کر آریہ سماج کے سالانہ جلسہ میں مجھے اپنے ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ وہاں ہونے والے بھجن اور تقاریر کے ساتھ ساتھ تحریک آزادی کی باتیں بھی سننے کو ملتی تھیں۔ کیا یہ محض ایک اتفاق تھا۔؟ یا اس کے پس

پردہ قدرت کی کوئی منشا تھی۔؟ گھر میں پہلے سے ہی ادبی ماحول تھا۔ اس لئے میں نے بھی تک بندی شروع کردی۔ مجھے یاد ہے کہ میری پہلی کویتا 'تاج محل' کچھ اس طرح تھی۔

تاج محل یہ تاج محل
کیسا سندر اتی سندرتر

لیکن تاج محل پر لکھی گئی یہ کویتا صرف اس کی خوبصورتی تک محدود نہیں تھی۔ بلکہ یہ کویتا ان کاریگروں اور مزدوروں کے حالات کو بھی بیان کررہی ہیں جنھوں نے تاج محل کو تعمیر کرنے میں اپنا خون، پسینہ بہایا تھا۔ اس کویتا کا آخری بند مجھے ابھی تک یاد ہے۔

جب رویا ہندوستان سکل
تب بن پایا یہ تاج محل

یقینی طور پر اُن دنوں مجھے آریہ عالموں کے ساتھ ساتھ کمیونسٹ انقلاب نے کافی متاثر کیا تھا۔ آج جب میں ان دنوں کی بات یاد کرتا ہوں تو میرے خیالوں کی موہوم تصویر میرے سامنے گھومنے لگتی ہے۔

خاص طور پر میں نے حب الوطنی سے لبریز کویتائیں بھی لکھیں، کوی سمیلنوں کا یہی تقاضہ تھا۔ لوگ ایسی کویتاؤں کو پسند بھی کرتے تھے۔ رزمیاتی نظمیں پسند کی جاتی تھیں۔ کویتا کے ساتھ نوجوانوں میں تقریری مقابلے بھی ہوا کرتے تھے۔ جوشیلے کوی سامعین کی پہلی پسند ہوا کرتے۔ آزادی کی تحریک کو ایسے نوجوانوں سے کافی ترغیب ملتی تھی۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے، جب میں وکٹوریہ کالج گوالیا میں زیر تعلیم تھا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی میری دلچسپی تھی۔ میں کالج میں طلبہ یونین کا پہلا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا تھا۔ اس کے بعد نائب صدر کے لئے منتخب کیا گیا۔ اُن دنوں صدر کوئی پروفیسر ہی ہوا کرتا تھا۔ طلبہ یونین کی ذمہ داری تھی کہ وہ سالانہ جلسے کا انعقاد کرے۔ مجھے یاد ہے کہ طلبہ یونین نے ایک سال کالج میں کوی سمّیلن کرنے کا فیصلہ کیا۔ گوالیار سے باہر کے کوی بھی مدعو کئے گئے تھے۔ یہ طے ہوا کہ کالج کے سالانہ جلسے میں مہاکوی 'نرالہ جی' کو مدعو کیا جائے۔ ان دنوں شری متی مہادیوی ورما، اور شری سومترا نندن پنتھ کا بہت شہرہ تھا۔ نرالہ جی کو مدعو کرنے کی ذمہ داری پروفیسر شیومنگل سنگھ سمن کو سونپی گئی۔ کالج کے لیے یہ بڑے فخر کا دن تھا۔ جب ہم نرالہ جی کو ریلوے اسٹیشن سے ان کی رہائش گاہ کے لئے لے جارہے تھے۔ اسی دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو مجھے زندگی بھر متاثر کرتا رہا۔ ہوا یہ کہ جب تانگہ اس سڑک سے گزرا جس پر مہارانی لکشمی بائی کی یادگاری علامت بنی ہوئی تھی۔ تو نرالہ جی نے اس ویرانگنا کو سلام کرنے کے لیے تانگہ تھوڑی دیر کے لئے رکوا دیا۔ ان کی نظر لکشمی بائی کی یادگاری علامت کے قریب بیٹھی ایک غریب خاتون پر پڑی، اور وہ خاتون خود کو سردی سے بچانے کے لیے کوشاں تھی۔ جیسے ہی نرالہ جی کی نظر اس خاتون پر پڑی تو اُس مہاکوی نے اپنا کمبل اتار کر اس خاتون کو اڑھا دیا۔ ہم سب یہ دیکھ کر متعجب رہ گئے۔ نرالہ جی کی عظیم شخصیت کی چھوٹی سے جھلک دیکھ کر ہم سب جذباتی ہوگئے۔ گھر پہنچنے پر ہم نے نرالہ جی کے لیے علاحدہ سے کمبل کا بندوبست کیا۔ لیکن نرالہ جی کے ذریعہ سردی سے پریشان خاتون کو کمبل دینے کا واقعہ ہمارے ذہن کے کینوس پر ہمیشہ کے لیے نقش ہوگیا۔

وکٹوریہ کالج سے متعلق ایک اور واقعہ مجھے یاد آرہا ہے۔ طلبہ یونین کی جانب سے شب میں کوی سمّیلن کا انعقاد کیا گیا تھا۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی مقامی کویوں کے ساتھ باہر کے کویوں کو بھی دعوت نامہ دیا گیا تھا۔ وکٹوریہ کالج کے پرنسپل پروفیسر پیئرس کوی سمّیلن سننے کے لئے حاضر ہوئے تھے۔ ہال سامعین سے کچھا کچھ بھرا ہوا تھا۔ لیکن کچھ کویوں کے آنے میں تاخیر ہورہی تھی۔ وہ موقع کے مطابق سجنے دھجنے میں لگے ہوئے تھے۔ جب زیادہ تاخیر ہونے لگی تو طلبا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا۔ میں جرأت مندانہ فیصلہ کے ساتھ اسٹیج پر پہنچ گیا اور یہ اعلان کردیا کہ کچھ کویوں اور شاعروں کے آنے میں تاخیر ہورہی ہے۔ سامعین مزید انتظار کے متحمل نہیں ہیں۔ اس لیے کوی سمّیلن کو ملتوی کیا جاتا ہے۔ سامعین اپنے گھروں کے لیے جاسکتے ہیں۔ پورے ہال میں خاموشی طاری ہوگئی۔ طلبہ کویتا کے شوقین تھے۔ لیکن کچھ کویوں کے ذریعہ اسٹیج پر آنے میں ضرورت سے زیادہ تاخیر کئے جانے کے سبب طلبا ناراض ہوگئے۔ تب تک کچھ کوی اسٹیج پر پہنچ چکے تھے۔ وہ نوجوانوں سے اپیل کررہے تھے کہ وہ اب کویتا سن کر ہی جائیں۔ لیکن طلبا نے ان کی بات نہیں سنی۔ میرے یہ کہنے پر کہ یہ کوی سمّیلن ملتوی کیا جاتا ہے۔ سب طلبا ہال کے باہر چلے گئے۔ بعد میں جب کبھی کوی سمّیلن ہوتے، تو کوی وقت پر آنے کا خیال رکھنے لگے تھے۔ میں نے وکٹوریہ کالج گوالیار سے گریجویشن کا امتحان پاس کیا۔ آگے پڑھنے کا ارادہ ضرور تھا، لیکن وسائل کا فقدان تھا، گوالیار کی ریاست ذہین طلبہ کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظیفہ دیا کرتی تھی۔ ان میں جنوب سے آئے چھتریہ طلبا زیادہ ہوتے تھے۔ میں نے بی اے پاس کرتے کرتے خاصی شہرت حاصل کرلی تھی۔ میری تقریر لوگ شوق سے سنتے تھے اور میری کویتائیں بھی پسند کی جاتی تھیں۔ گوالیار کی ریاست میں میرا نام بھی پہنچ چکا تھا۔ جب اعلیٰ تعلیم کے طلبہ کا انتخاب ہونے لگا تو مجھے بھی اس میں موقع مل گیا۔ گوالیار کے طلبا آگرہ یونیورسٹی سے ملحق ہونے کے سبب کانپور جاتے تھے، کانپور میں ڈی۔اے۔وی، کالج اور سناتن دھرم کالج، دونوں کا بڑا نام تھا۔ میں نے ڈی اے وی کالج میں داخلہ لیا۔ کالج کی عمارت کافی بڑی تھی۔ ہاسٹل میں طلبا کے قیام کا معقول انتظام بھی تھا۔ اس لیے میں نے ہاسٹل ہی میں رہنے کا ارادہ کیا۔

❑❑❑

۲۰۱۷ء میں شائع کتاب 'چنی ہوئی کویتائیں' کے دیباچہ میں سابق وزیر اعظم کا تبصرہ

(بشکریہ روزنامہ راشٹریہ سہارا)

لکھنؤ کی رگ رگ میں...!

اٹل بہاری واجپئی لکھنو کے مختلف علاقوں اور یہاں کے متعدد مقامات پر اپنی زندگی کا، کافی لمبہ عرصہ گزارا۔انھیں یہاں کی دودھ جلیبی بہت پسند تھی اور یہاں کے بہت سے لوگ جن سے وہ خوب ملاقاتیں کرتے ۔چار باغ کے اے۔پی سین روڈ پر واقع ''ونا یک بھون'' جسے اب ''راجو بھیا اسمرتری بھون'' کہا جاتا ہے اس میں اٹل بہاری واجپئی کا قیام بیس سال تک رہا۔ یہاں خاص نشستیں ہوتی تھیں،جس سے اٹل جی کی بہت سی سنہری یادیں وابستہ ہیں۔۱۹۵۰ ،سے ۱۹۷۰ تک،اسی تاریخی مکان میں رہتے ہوے اٹل بہاری وجپئی نے پنڈت دین دیال اپادھیائے،نانا دیش مکھ، بھاؤ راؤ دیورس ،مادھو بابو جیسی اہم شخصیتوں کے ساتھ رہ کر سنگھ کے ترجمان کی حیثیت سے کام کیا۔

چار باغ میں ہی واقع ''ماروتی ہوٹل'' سے اٹل بہاری واجپئی کی کچھ اہم یادیں وابستہ ہیں۔ ماروتی ہوٹل کے مالک رام سیوک مشرا جو اسوقت اپنی عمر کے ۸۰ ربرس کے پڑاؤ پر ہیں،وہ اس بات کا ذکر کرتے ہیں۔ کہ جب اٹل جی سے میری ملاقات ہوئی تھی تو اسوقت میری عمر ۱۶ رسال کی تھی،اور اٹل جی غالبا ۲۴ رسال کے رہے ہوں گے۔وہ مجھے اپنا چھوٹا بھائی مانتے تھے۔ہم دونوں میں خوب بنتی تھی۔وہ دہی،لسی، چائے اور جلیبی کے بڑے شوقین تھے۔

''لکھنؤ ہم پر فدا اور ہم فدائے لکھنؤ''

یہ مصرع جناب اٹل بہاری واجپئی کو بہت پسند تھا،وہ جس کسی پروگرام میں شرکت فرماتے ،اس مصرع (لکھنؤ ہم پر فدا اور ہم فدائے لکھنؤ) کو ضرور پڑھتے ۔اس لئے کہ انھوں نے اس مصرع میں لکھنؤ کی تہذیب کو دیکھا ہی نہیں بلکہ اسے جیا بھی ہے۔اٹل جی لکھنؤ کو جتنا چاہتے تھے،اسی طرح سے لکھنؤ بھی ان پر اپنی محبتیں نچھاور کرتا رہا۔

سابق وزیر اعظم جناب اٹل بہاری واجپئی ۷۲ رسال قبل ۱۹۴۲ رمیں ''سنگھ'' کے کارکن کی حیثیت سے لکھنؤ تشریف لائے،تو وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔انھیں لکھنؤ کی نفاست و وضع قطع اور یہاں کے لوگ اتنے پسند آئے کہ انھوں نے یہیں سے اپنی سیاست کے سفر کا آغاز کیا۔۱۹۴۷ رمیں جب وہ لکھنؤ دوبارہ، واپس آئے تو ان کی صحافتی مصروفیت کی وجہ سے ان کی پی ایچ ڈی مکمل نہ ہوسکی۔

''ونا یک بھون'' کے سامنے ''مشرا جلپان گرہ'' تھا جہاں صبح و شام خوب بیٹھکیں ہوتیں اور وہیں چائے بھی پیتے تھے۔

''مشرا جلپان گرہ'' کے مالک وجئے مشرا خود بتاتے ہیں کہ میری عمر ۱۵ رسال کی تھی تو یہاں اٹل جی آئے تھے، میرے والد اور اٹل جی کے درمیان اچھا دوستانہ تھا،وہ صبح وشام معمول کے مطابق جلیبی کھانے آیا کرتے تھے،اور صبح میں ناشتے میں دودھ ضرور لیتے تھے،اور پارٹی کے کارکنان بھی یہاں کچھ نہ کچھ ضرور کھاتے تھے۔اسی دکان کے سامنے بیٹھ کر سنگھ کی سیاسی لائحہ عمل تیار کیا جاتا تھا۔میں نے انھیں ہمیشہ سنگھ کو مضبوط بنانے کے لئے متفکر دیکھا۔جب اٹل بہاری واجپی جی لکھنؤ سے ایم۔پی، بن کر دہلی پہونچے تو کافی دنوں کے بعد چار باغ میں رہنے والے تیواری جی سے دہلی میں اٹل بہاری واجپئی جی سے ملاقات ہوئی تو اٹل جی نے اُن سے پوچھا آپ ہوٹل والے مشرا جی کو جانتے ہیں۔؟؟ اتنے بڑے قومی لیڈر اور ان کی محبت و اپنائیت یہی وہ چیزیں ہیں جو اٹل بہاری واجپئی جی کو سب سے منفرد کرتی ہیں۔

❑❑❑

(بشکریہ روزنامہ ہندوستان)

اقوام متحدہ میں اٹل بہاری واجپئی کا ہندی میں خطبہ

'وسودھیو کٹمبکم' ہندوستان کا آئیڈیل

میں ہندوستانی عوام کی جانب سے اقوام متحدہ کے لئے نیک خواہشات کا پیغام لایا ہوں، اس عظیم جلسے کے ۳۲ رویں اجلاس کے موقع پر اقوام متحدہ میں ہندوستان کی پختہ یقینی کا دوبارہ اظہار کرنا چاہتا ہوں عوامی حکومت کو زمام اقتدار سنبھالے ہوئیے ابھی محض چھ ماہ ہوئے ہیں۔ پھر بھی اتنی قلیل مدت میں ہماری کامیابیاں قابل ذکر ہیں۔ ہندوستان میں انسان کے بنیادی حقوق دوبارہ مستحکم ہوئے ہیں۔جس خوف و دہشت کے ماحول نے ہمارے عوام کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔اسے ہم توڑنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ہم نے ایسے آئینی اقدام کئے ہیں جس سے یہ یقینی ہوجائے کہ جمہوریت اور اس کی بنیادی آزادی اب کبھی پائمال نہیں ہوگی۔صدر محترم 'وسودھیو کٹمبکم' ہمارے ہندوستان کی یہ روایت بہت پرانی ہے اور ہمارا اس بات پر یقین ہے کہ ساری دنیا ایک پریوار کی طرح ہے۔متعدد کوششوں اور دشواریوں کے باوجود اقوام متحدہ کی شکل میں اس خواب کے شرمندہ تعبیر ہونے کے امکان قوی ہیں۔

میں یہاں پر ممالک کی حکومت کی اہمیت کے بارے میں نہیں سوچ رہا ہوں بلکہ عوامی وقار اور اس کی فلاح و بہبود میرے لئے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔لہذا ہماری کامیابیوں اور ناکامیوں کو ایک ہی میزان پر، پرکھنا چاہئے۔کہ ہم پورے انسانی معاشرے، خاص کر مرد، عورت اور لڑکے اور لڑکیوں کے لئے عزت وانصاف دلانے کے لئے مستقل پیش رفت کررہے ہیں۔افریقہ میں چیلنج بہت واضح ہے، سوال یہ ہے کہ عوام کو عزت اور آزادی کے ساتھ رہنے کے مکمل حقوق حاصل ہیں۔نسلی تفریق پر یقین رکھنے والی اقلیت کسی بڑی اکثریت پر ہمیشہ ناانصافی کوروا اور انھیں دیوار سے لگا کر کب تک رکھے گی۔؟ حال ہی میں اسرائیل ویسٹ بینک اور غزہ میں نئی بستیاں بسا کر مقبوضہ علاقوں میں اپنی آبادی کو منتقل کرنے کی کوشش کررہا ہے، اقوام متحدہ کو اسے اپنی پوری توانائی کے ساتھ مسترد کردینا چاہئے۔اگر ان مسائل کا اطمینان بخش تصفیہ نہیں ہوتا تو اس کے برے نتائج اس علاقے سے باہر بھی مرتب ہوسکتے ہیں۔

صدر محترم ہندوستان سبھی ممالک سے پُرامن دوستی کا خواہاں ہے۔کسی پر اپنے اقتدار کی بالادستی قائم نہیں کرنا چاہتا۔ ہندوستان خود کو ایک جوہری توانائی حاصل کرنے والا ملک نہیں کہلانا پسند کرتا۔

میں ہندوستان کی جانب سے اس عظیم الشان اجلاس میں اس بات کی یقین دہانی کرانا چاہتا ہوں کہ ہم دنیا میں ایک مثالی ملک کی حیثیت سے انسانی وقار اور اس کی فلاح و بہبود کے لئے ایثار و قربانی میں ہمیشہ سبقت کریں گے۔

جے جگت، شکریہ

❑❑❑

(بشکریہ روزنامہ ہندوستان)

جلیاں والا باغ کی ایک چشم دید گواہ رتن بائی

پی پی شریواستورندؔ
R-16، سیکٹر-11، نوئیڈا
موبائل: 9711422058

13اپریل 1919 بیساکھی کا دن، رولٹ ایکٹ کے خلاف امرتسر کے جلیاں والا باغ میں مہاتما گاندھی کی پکار پر بڑی تعداد میں لوگ جمع ہورہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے انسانی جذبات کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو اور لوگ اپنے وطن کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لیے بے قرار ہوں۔ اس وقت ایک ایسا ہی دل دوز حادثہ ہوا جس کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ شام تقریباً ساڑھے چار بجے سے پانچ بجے درمیان امرتسر میں تعینات افسر آر- ای- ایچ ڈائر نے نہتے ہندوستانی مردوں، عورتوں اور معصوم بچوں پر اس وقت تک گولیاں برسائیں جب تک سب کچھ ختم نہیں ہوا۔ یہ دردناک حادثہ فرنگیوں کے دامن پر ایسا داغ ہے کہ جسے اُن کی آنے والی نسلیں بھی کبھی نہیں دھو پائیں گی، حالانکہ اس قتل وغارت گری کی جانچ کے لئے انگریز حکومت نے لارڈ ہنٹر کی صدارت میں ایک جانچ کمیٹی بیٹھائی لیکن اس سے عام ہندوستانی مطمئن نہیں تھے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں پنجاب میں ہوئی زیادتیوں کے خلاف ایک الگ کمیٹی بیٹھائی۔ اس کمیٹی میں موہن داس کرم چند گاندھی اور چترنجن داس کے علاوہ کئی اور ہندوستانی رہنما بھی شامل تھے۔ موتی لال نہرو کمیٹی نے اپنی رپورٹ (1920) دو حصّوں میں تیاری کی۔ اس رپورٹ کے حصہ دوم میں تقریباً 650 ایسے لوگوں کے بیانات درج ہیں جنہوں نے پنجاب میں انگریز حکومت کی زیادتیوں کو اپنی آنکھوں سے نہ صرف دیکھا ہے بلکہ اسے شدّت سے محسوس بھی کیا ہے۔ جلیاں والا باغ کے سلسلے میں ایک ایسی چشم دید گواہ تھیں رتن بائی عرف رتّو بائی بیوہ چھجّو بھگت ساکن امرتسر۔

13اپریل کو جلیاں والا باغ میں موت کا رقص ہوجانے کے بعد یہ خاتون اپنے شوہر کی تلاش میں جلیاں والا باغ پہنچی۔ جلیاں والا باغ میں ایک رات گزار کر صبح 14 اپریل کو اپنے شوہر کی لاش کو گھر لے کر لوٹی۔ رتن بائی نے اپنا 13 اپریل کی شام سے 14 اپریل کی صبح کا تجربہ پنڈت موتی لال نہرو کی رپورٹ میں بیان کے طور پر درج کرایا ہے جو کچھ اس طرح ہے:

''میں اس وقت اپنے مکان پر تھی جو جلیاں والا باغ کے نزدیک ہے۔ جس وقت میں نے بندوق سے چلنے والی گولیوں کی آواز سُنی، اس وقت میں آرام کررہی تھی۔ مجھے بہت فکر ہوئی کیونکہ میرے شوہر اسی وقت کچھ لوگوں کے ساتھ جلیاں والا باغ گئے تھے۔ میں روتی بلکتی دو عورتوں کو ساتھ لے کر چل پڑی جہاں سے گولیوں کی آواز آرہی تھی۔ دہشت زدہ عورتیں کچھ دور چل کر واپس آگئیں اور میں تنہا رہ گئی۔

جب میں جلیاں والا باغ پہنچی تو میں نے دیکھا کہ مُردوں کے ڈھیر لگے ہیں۔ لاشوں کی اس بھیڑ میں میں اپنے شوہر کو تلاش کرنے لگی۔ چاروں طرف خون ہی خون دکھائی دیتا تھا جیسے خون کے ندی نالے بہہ رہے ہوں۔ لاشوں کے ڈھیر میں خون سے لتھڑے لوگوں میں اپنے شوہر کی لاش کو تلاش کرنا بڑا مشکل تھا۔ پتہ نہیں مجھ میں یہ ہمّت کہاں سے آگئی۔ میں نے بھگوان کا نام لے کر ایک ایک لاش کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کیا۔ کوئی بھی لاش ایسی نہ تھی جو خون سے نہائی نہ ہو۔ کافی کوشش کے بعد مُردوں کے ایک ڈھیر میں مجھے اپنے شوہر کی لاش مل گئی۔ اُن کا تمام جسم خون میں لت پت تھا۔ میں نے انہیں بڑی مشکل سے کھینچ کر ایک طرف نکالا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا مگر وہاں سنّاٹے کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ میں حیران پریشان اپنے شوہر کی لاش کے پاس کھڑی رہی۔ کچھ دیر بعد لالہ سندر داس کے دو بیٹے

وہاں آپہنچے۔ میں نے اُن سے گڑگڑا کر کہا کہ وہ میرے گھر سے ایک چارپائی لادیں تاکہ میں اپنے شوہر کی لاش کو گھر لے جاسکوں۔ میری منّتیں سن کر وہ چلے گئے۔

اس وقت رات کے تقریباً ساڑھے آٹھ بجے ہوں گے، چاروں طرف سنّاٹا تھا۔ باغ میں کوئی بھی آدمی زندہ نظر نہیں آیا کیونکہ انگریز حکومت کا کرفیو آرڈر تعمیل ہو چکا تھا۔ میں کھڑی کھڑی روتی رہی۔ دور کچھ لوگ لاشوں میں کچھ تلاش کر رہے تھے مگر میں اُن کو نہیں جانتی تھی۔ البتہ ایک سردار جی پاس سے گزرے۔ میں نے اُن سے مدد مانگی۔ سردار جی کو مجھ پر رحم آ گیا اور میں اُن کی مدد سے اپنے شوہر کی لاش کو ایک سوکھی جگہ پر لانے میں کامیاب ہوگئی۔ خون سے لت پت زمین میں سوکھی جگہ ملنا مشکل تھا۔ سردار جی نے میرے شوہر کو سر کی طرف سے اٹھایا اور میں پیروں کی طرف سے پکڑے ہوئے تھی۔ اس کے بعد سردار جی چلے گئے۔

میں نے رات دس بجے تک سندر داس کے بیٹوں کا انتظار کیا مگر وہاں کوئی اور نہیں دکھائی دیا۔ میں حیران و پریشان اور جنون کے عالم میں کٹرہ کی طرف چل پڑی۔ میں نے سوچا کہ ٹھاکر دوارہ کے کچھ لڑکوں سے مدد کی التجا کروں گی تاکہ میں شوہر کی لاش گھر تک لے جاسکوں۔ ابھی میں تھوڑی دور گئی تھی کہ ایک مکان کی کھڑکی میں بیٹھے ایک آدمی نے مجھ سے پوچھا کہ اتنی رات گئے میں کہاں جارہی ہوں۔ میں نے گڑگڑا کر کہا کہ مجھے کچھ لوگوں کی مدد چاہئے تاکہ میں اپنے شوہر کی لاش اپنے گھر لے جاسکوں۔ اس آدمی نے کہا کہ وہ ایک انجان زخمی کی تیمار داری کر رہا ہے اس لیے وہ میری مدد نہیں کر پائے گا۔ مایوس ہوکر میں پھر کٹرے کی طرف چل پڑی۔ تھوڑی دور پر ایک بوڑھا آدمی کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھا تمباکو پی رہا تھا۔ میں نے اُن لوگوں سے بہت منّت کی۔ بوڑھے آدمی کو مجھ پر ترس آیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے میری مدد کرنے کے لیے کہا مگر اُن لوگوں نے صاف انکار کر دیا۔ ان کو ڈر تھا کہ کہیں گولی نہ مار دی جائے۔

بوڑھا آدمی ذاتی طور پر بہت کمزور تھا اس لیے وہ میری مدد نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے لوگوں پر دہشت سوار تھی کہ اُن کو بھی کوئی گولی نہ مار دے۔ میں لاچار ہوگئی اور الٹے پاؤں اپنے شوہر کی لاش کی رکھوالی کرنے کے لیے واپس آ گئی۔ اتفاق سے مجھے راستے میں ایک بانس کا ٹکڑا مل گیا جس کو میں اپنے ساتھ لے آئی۔ باغ میں چاروں طرف اندھیرا اور سنّاٹا تھا۔ کچھ آوارہ کتّے لاشوں کو نوچ کھسوٹ رہے تھے۔ میں نے اس بانس سے اُن کتّوں کو اِدھر اُدھر بھگایا اور اپنے شوہر کی لاش سے دور رکھا۔ اب میں جذبات پر قابو پا چکی تھی اور مجھ میں حوصلہ آ گیا تھا۔ میرے نزدیک ہی ایک بھینس جس کو گولی لگی تھی اَدھ مری حالت میں کراہ رہی تھی۔ ایک لڑکا جس کی عمر تقریباً 20 سال رہی ہوگی درد سے تڑپ رہا تھا۔ میں نے اپنی دھوتی سے اُسے ڈھکنا چاہا مگر اس نے منع کر دیا۔ رات کی سردی بڑھ گئی تھی، اس لڑکے نے پانی مانگا مگر میں اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود پانی نہ لاسکی کیونکہ چاروں طرف اندھیرا تھا اور میں اپنے شوہر کی لاش کو چھوڑ کر کہیں دور بھی نہیں جاسکتی تھی۔ میں نے رات کے ہر گھنٹہ کی آواز کو صاف صاف سُنا ہے۔ رات کے تقریباً دو بجے سامنے لاشوں میں پھنسے ایک جاٹ نے جو سلطان گنج کا رہنے والا تھا مدد کے لیے آواز دی۔ اس نے مجھے اپنی ایک ٹانگ اوپر اٹھانے کے لیے کہا۔ میں نے بڑی مشکل سے اور اپنی پوری طاقت لگا کر خون میں لتھڑے ہوئے کپڑوں کو کھینچ کر اُس کی ٹانگ درست کی۔ اُس کے بعد مکمّل خاموشی چھا گئی۔ ہر طرف مرگھٹ کا سنّاٹا تھا۔ صبح ساڑھے پانچ بجے تک کوئی دکھائی نہیں دیا۔ صبح 6 بجے لالہ سندر داس اور اُن کے بیٹے میری گلی کے کچھ لوگوں کے ساتھ چارپائی لائے جن کی مدد سے میں اپنے شوہر کی لاش کو گھر لاسکی۔

صبح کی روشنی میں میں نے کافی لوگوں کو اپنے عزیزوں، دوستوں اور رشتہ داروں کو لاشیں تلاش کرتے دیکھا۔ میں نے اپنی پوری رات ایک سُنسان ویران خون میں لت پت سیکڑوں مُردوں کے بیچ گزاری تھی۔ وہ نظارہ میں اپنے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ اس رات جو بھی مجھ پر گزرا، وہ صرف محسوس کیا جاسکتا ہے، بتایا نہیں جاسکتا۔ مُردوں کے جنگل میں کسی کا منہ آسمان کی طرف تھا اور کوئی اوندھے منہ پڑا تھا۔ معصوم بچّوں اور کم عمر لڑکوں کی تعداد بہت تھی۔ میں وہ نظارہ کبھی نہیں بھول سکتی۔ لاشوں کے اس جنگل میں صرف میں ہی ایک زندہ ہستی تھی۔ اس رات مجھے وہاں کسی زندہ آدمی کی آواز نہیں سنائی دی۔ کبھی کبھی نزدیک اور دور بھونکتے اور آپس میں لڑتے جھگڑتے کتّوں کی آواز بے شک سنائی دیتی تھی۔ میں اتنا کہہ سکتی ہوں کہ سیکڑوں ہزاروں مُردوں کے درمیان میں نے وہ رات گزاری تھی وہ یا تو میں محسوس کر سکتی ہوں یا میرا بھگوان۔''

رتن بائی کے اس سنسنی خیز بیان جوموتی لال نہرو کمیٹی کی رپورٹ میں درج ہے کو پڑھ کر جہاں ایک طرف اُن کی اپنے شوہر کے لیے شردھا کا پتہ چلتا ہے، وہیں دوسری طرف انگریز حکومت کے ظلم وتشدّد کے سخت اور بے رحم کارناموں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ جلیاں والا باغ نیشنل میموریل ٹرسٹ کے سابق جنرل سکریٹری جناب ایس، کے مُکھرجی کے مطابق رتن بائی اپنی زندگی کے آخری دنوں تک بلاناغہ جلیاں والا باغ آکر کچھ وقت ضرور گزارا کرتی تھیں۔ جلّاد جاٹ کے باغ یعنی جلیاں والا باغ میں 13 اپریل 1919 کو ہوئی انگریز حکومت کی اس غیر انسانی حرکت اور ظلم وتشدّد کا جب بھی ذکر آئے گا، تب رتن بائی کا یہ بیان چیخ چیخ کر انگریزوں کی بربریت کی گواہی دے گا:

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

□□□

نظمیں

گلزار

(سمپورن سنگھ کالرا)

بوسکیانہ، نرگس دت روڈ،
پالی ہل، باندرہ (مغرب)
ممبئی-400050

رابطہ: 022-26461957

لال حویلی

حویلی سے کوئی بھی لوٹ کر آتا نہیں ہے

کچھ ایسا پنچ تنتر کی کہانی میں پڑھا تھا
کہ جنگل والے کوئی جانور چُن کر
گُپھا میں، حاکم جنگل کو، خود ہی بھیج دیتے تھے
کوئی بھی لوٹ کر آتا نہیں تھا

یہی مشہور ہے اُس لال حویلی کے لئے بھی
جو جمنا کے کنارے پر کھڑی ہے
گھنا جنگل ہے اُس کے دائیں بائیں اور...
ندی بہتی ہے، اُس کے پیچھے سے لگ کر

کوئی سنکٹ اگر آ جائے گا وَں پر
سنا ہے گاؤں کے سب لوگ چُن کر
کسی اِک شخص کو ہر بار اُس میں بھیج دیتے ہیں
مگر پھر لوٹ کر آتا نہیں کوئی!

کوئی شکتی وہاں پر ہے
جو ہضم کر جاتی ہے اُس کو!

کچھ ایسی عمر ہی میں تھے

کچھ ایسی عُمر ہی میں تھے....

کچھ ایسی عُمر ہی میں تھے
جب آزادی کا اندولن شروع تھا
ہمارے کالجوں میں جب
غُلامی سے... بغاوت کی لڑائی ہی 'پڑھائی' تھی
پُکارا تھا ہمارے نیتا نے ہم کو:
''تمہاری منتظر ہیں سُولیاں، آؤ''
لہو دو! مَیں تمہیں آزادی دُوں گا''
بڑے جو شیلے دن تھے وہ
ابھی تک پیٹھ پر اُن لاٹھیوں کے داغ روشن ہیں!

کچھ ایسا شور پھر سے سُن رہا ہُوں، کالجوں میں
وہی منظر دِکھائی دے رہے ہیں
کہاں گُمراہ ہوئے تھے ہم؟

کہو کیا اِنقلاب آنے کے کچھ آثار لگتے ہیں؟

غروب ہوتا ہوا سورج دکھائی دے رہا ہے

غروب ہوتا ہوا سورج دِکھائی دے رہا ہے!
ہزاروں بلب روشن کر کے، کوئی
اندھیرے کو چھُپانا چاہتا ہے
کہ آنکھیں رات کو پہچان نہ پائیں

اندھیرا جیبھ پر رکھّا ہُوا ہے
چپکتا ہے لبوں سے
زباں کھُلتی نہیں ہے
نمک میں گھُل گیا ہے اب اندھیرا
مِری روٹی میں وہ گوندھا ہُوا ہے

اندھیرا اچھّا لگتا ہے تو میرے دوست
آنکھیں بند کر لو
کہ سورج تو غروب ہوتا دِکھائی دے رہا ہے!

———

نیم شب

یہ نیم شب، جس میں جی رہے ہیں
اُتر رہی ہے، نہ چڑھ رہی ہے
چِپک گئی ہے لحاف پر جس طرح
پُرانا غلاف چپکے
یہ آسماں باسی لگ رہا ہے
کھٹاس کی باس آ رہی ہے

نظام پھینٹا گیا ہے سارا
فضاؤں میں بھاپ اُڑ رہی ہے

نہ کھینچنے سے اُترتی ہے شب
نہ نوچنے سے اُدھڑ رہی ہے
یہ نیم شب، جس میں جی رہے ہیں!

———

یہ گونگا ہے کون

یہ گُونگا ہے کون؟
کھانستا ہے تو لفظ اُڑتے ہیں، اُس کے مُنھ سے
کہ شہر کو صاف رکھنا دُشوار ہو گیا ہے
چورا ہے پر بات چل رہی ہے
لکھاری ہوگا ——— ادیب کوئی
کسی نے پوچھی تھی اُس کی رائے
اور ——— زباں کاٹ لی تھی اُس کی!!

❑❑❑

غزلیں

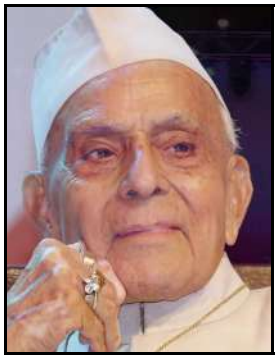

گلزارؔ دہلوی

(آنند موہن زتشی)

C-99 سیکٹر ۲۶،

نوئیڈا

موبائل: 8860844043

دل ہی دل میں درد کے ایسے اشارے ہو گئے
غم زمانے کے شریک غم ہمارے ہو گئے

امن کی طاقت کو کچلا سچ کو رسوا کر دیا
دشمنوں کے چاردن میں وارے نیارے ہو گئے

یہ زمانہ کس قدر بارِ گراں ثابت ہوا
اپنے بیگانے ہوئے بیگانے پیارے ہو گئے

جو ابھی محفوظ ہیں تنقید ہے ان کا شعار
حال ان کا پوچھئے جو بے سہارے ہو گئے

بن کھلے مرجھا گئیں کلیاں چمن میں کس قدر
زرد رو کس درجہ ہائے ماہ پارے ہو گئے

دشمن دیں، دشمن جاں، دشمن امن و سکوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے ہو گئے

اشک غم میں نورِ رحمت اس طرح شامل رہا
چاند تاروں سے سوا یہ چاند تارے ہو گئے

ڈوبنے والوں سے زائد کھا رہا ہے ان کا غم
جن کو ساحل تیغ عریاں کے کنارے ہو گئے

حیف گلزارؔ جہاں میں چھا گئی غم کی گھٹا
جو شگوفے تھے چمن میں وہ شرارے ہو گئے

عمر جو بے خودی میں گزری ہے
بس وہی آگہی میں گزری ہے

آسرا ان کی رہبری ٹھہری
جن کی خود رہزنی میں گزری ہے

ہم نشینی پہ فخر کر ناداں
صحبت آدمی میں گزری ہے

کوئی موجِ نسیم سے پوچھے
کیسی آوارگی میں گزری ہے

آس کے جگنوؤں سدا کس کی
زندگی روشنی میں گزری ہے

یوں تو شاعر بہت سے گزرے ہیں
اپنی بھی شاعری میں گزری ہے

میرؔ کے بعد غالبؔ و اقبالؔ
اک صدا، اک صدی میں گزری ہے

غزلیں

جینت پرمار

12، شانتی نکیتن سوسائٹی
رادھاسوامی روڈ، رانپ، احمدآباد
رابطہ: 079-27524234

آگ اک جسم کے شجر میں تھی
خواہشوں کی ہوا سفر میں تھی

ہر طرف اک عجیب منظر تھا
اک گھٹن آسمان بھر میں تھی

زرد شاخوں نے پھول ٹانک لئے
موسموں کی صدا شجر میں تھی

پھول کو چوم کر اڑی تتلی
کیسی جھنکار اس کے پر میں تھی

اک بوسہ چٹک کے پھول بنا
اس کی خوشبو مرے ثمر میں تھی

باغ میں آئی تھی نئی تتلی
شوخی ہر پھول کی نظر میں تھی

مجھ کو تکتے رہے در و دیوار
اجنبی سی خود اپنے گھر میں تھی

مرنے کی تیاری تھی
رات وہ کتنی بھاری تھی

خار کی مانند چبھتے ہیں
جن پھولوں سے یاری تھی

بھول چکے تھے ہم دونوں
وہ تصویر پرانی تھی

اپنے آگے میں ہی تھا
کس سے پردہ داری تھی

عشق کی بازی بھی ہم نے
ہنستے ہنستے ہاری تھی

گھپ اندھیرے جنگل میں
ہم نے رات گزاری تھی

دور آسمانوں میں

چندر بھان خیالؔ

مکان نمبر ۲۳، کوشک انکلیو
براڑی ایکسٹینشن، دہلی
موبائل: 9971903035

آسمان دنیا سے، دور آسمانوں میں
یعنی آنکھوں سے اوجھل، سب سیاہ خانوں میں
گونجتا ہے نام اس کا جو زمیں پہ رہتا ہے
اور جس کے سائے کی سب پہ حکمرانی ہے

ہر خلا کے ہونٹوں پر ایک ہی کہانی ہے
رنگ رنگ میں شامل رنگ زندگانی ہے
روشنی کی لہروں پر بیٹھ کر تو دیکھو تم
سمت سمت حرکت اور ہر دِشا میں ہلچل ہے

خامشی کے سینے میں اک صدا مسلسل ہے
ہر کوئی جسے سن کر بے قرار و بے کل ہے
قلب میں سمٹتی ہے کائنات کی وسعت
اور پھر اسی لمحہ ٹوٹتی ہے خاموشی

سننے والے سنتے ہیں دوریوں کی سرگوشی
اور جانتے سب ہیں فکر کی خلا کوشی
عرش کی حقیقت جب آشکار ہوتی ہے
بستیوں میں انساں کی گونجتا ہے نام اس کا

وہ جو ہر گھڑی خود کی جستجو ہے کام اس کا
دور افق کے عارض پر رقص صبح و شام اس کا
جہل کے اندھیروں سے علم کی شعاؤں تک
وہ بھٹکتا رہتا ہے اور قیام کرتا ہے

خلوتوں کے سینوں میں جلوہ اپنا دھرتا ہے
شور کے سمندر میں ڈوبتا ابھرتا ہے
پھر وہ شہر امکاں کے کوچۂ تصوف میں
جشن وصل و قربت کا اہتمام کرتا ہے

بیکراں خلاؤں سے وہ کلام کرتا ہے
اور دنیا والو ں کے دکھ تمام کرتا ہے
وہ ہر ایک سکھ دکھ سے بے نیاز ہے لیکن
دکھ کی ایک دنیا نے اس کو گھیر رکھا ہے

❑❑❑

غزلیں

گلشنؔ بریلوی

(رمیش سکسینہ)

L2nd/17، علی گنج اسکیم
سیکٹر بی، لکھنؤ
موبائل: 9473584692

اے دینے والے تو نے دیا بھی تو کیا دیا
اک دل دیا سو وہ بھی الم آشنا دیا

کاغذ پہ دل کے رہ نہ سکا نقش آرزو
مایوسیوں نے حرف تمنا مٹا دیا

حضرت یہ بزمِ عام نہیں بزمِ خاص ہے
یہ کہہ کے اس نے بزم سے مجھ کو اٹھا دیا

غیرت نے میری مجھ کو زباں کھولنے نہ دی
پوچھا کسی نے حال تو بس مسکرا دیا

راہ عدم میں کوئی نہیں تھا ہمارے ساتھ
سب کچھ یہیں پہ رہ گیا جو تھا لیا دیا

ورنہ کبھی نہ ہوتیں مجھے منزلیں نصیب
ناکامیوں نے میری مجھے حوصلہ دیا

قابو زباں پہ رکھ نہ سکے ان کی بزم میں
آئے تھے کیا سنانے کو اور کیا سنا دیا

گلشنؔ چمن سے مٹ نہ سکی پھر بھی تیرگی
خود جب کہ میں نے اپنا نشیمن جلا دیا

کوئی ولی بھی نہیں اور نہ اک نبی ہوں میں
بس آپ ہی کی طرح عام آدمی ہوں میں

کبھی لگے ہے کہ رونق بہار کی ہوں میں
کبھی لگے ہے کہ بس شامِ زندگی ہوں میں

جو روز ایک نئے حادثے کے ساتھ اے دوست
ترے بغیر کٹی ہے وہ زندگی ہوں میں

جنم جنم سے مرا اس کا ساتھ ہے جیسے
حیات ہے وہ مری اس کی زندگی ہوں میں

یہی تو سوچ کے زندہ ہوں آج تک یارو
کچھ اپنی ہوں تو کچھ اوروں کی زندگی ہوں میں

جب اپنے آپ کے بارے میں سوچتا ہوں تو
لگے ہے جیسے کوئی ناؤ کاغذی ہوں میں

میں عرض کر دوں کہ شعر و سخن کی دنیا میں
زمانہ کہتا ہے گلشنؔ بریلوی ہوں میں

اردو ناول کے فروغ میں غیر مسلم قلمکاروں کا حصہ

(اتر پردیش کے خصوصی حوالے سے)

نعمان قیصر
C-66، فرسٹ فلور، عقب شاہین باغ، جامعہ نگر،
اوکھلا، نئی دہلی موبائل: 8130646324

اردو کی تمام اصناف کا سرسری جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس کی آبیاری میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو، سکھ اور عیسائی نے بھرپور حصہ لیا۔ آزادی سے قبل غیر مسلموں کی ایک بڑی آبادی کے افکار واظہار کا تخلیقی وسیلہ اردو تھی ۔ اس میں وہ اپنے قلبی واردات اور دلی جذبات واحساسات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ شاعری ہو یا نثر تمام اصناف میں غیر مسلم قلم کاروں کی ایک بڑی تعداد ہے، جن کی تخلیقی کاوشوں کو کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ غیر مسلم قلم کاروں کے علمی کمالات، تخلیقی تفردات، تحقیقی اور تنقیدی ادراکات کا دائرہ انتہائی وسیع وبسیط ہے۔ اردو سے غیر مسلم قلم کاروں کی ذہنی اور فکری وابستگی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ ایک سیکولر زبان ہے اور گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے۔ ناول کے باب میں بھی غیر مسلم قلم کاروں کی تخلیقی انفرادیت انتہائی نمایاں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غیر مسلم ناول نگاروں نے اس کی زرخیزی اور ثمر آوری میں بھر پور کردار ادا کیا جس کی وجہ سے اردو ناول اردو کی دوسری اصناف کے ہم پلہ قرار پایا۔

اس مضمون کے تحت اتر پردیش کے غیر مسلم ناول نگاروں کی خدمات کا جائزہ مقصود ہے۔ اتر پردیش ہندوستان کی ایک مردم خیز ریاست ہے ۔ یہاں کے چپے چپے پر تخلیقی ذہانتیں پنہاں ہیں ۔ اردو ناول کے باب میں بھی اتر پردیش کے غیر مسلم اصحابِ قلم نے اپنی تخلیقی ہنرمندی کا ثبوت دیا۔ یہ سچ ہے کہ 'مراۃ العروس' (1869) لکھ کر اردو میں صنف ناول کی بنیاد بجنور کے ڈپٹی نذیر احمد نے رکھی، لیکن ناول کی اس روایت کو لکھنؤ کے پنڈت رتن ناتھ سرشار نے آگے بڑھایا جبکہ موضوع اور اسلوب کی سطح پر بنارس (لمہی) کے پریم چند نے اردو ناول کو وقار واعتبار عطا کیا۔ پریم چند نے اپنی شعوری کوشش کی وجہ سے ابتدائی دنوں میں ہی اردو ناول کو عصری مسائل وموضوعات اور زمینی حقیقت سے پوری طرح ہم آہنگ کر دیا تھا۔ پریم چند سے پہلے اردو میں داستانوی فضا عام تھی، خیالی واقعات اور ماورائی کرداروں (جن وپری) کی بھرمار تھی لیکن پریم چند کی کوششوں کی وجہ سے اردو ادب زندگی اور حقیقت کا ترجمان ہوگیا۔ 1936 میں پریم چند نے لکھنؤ میں منعقد ترقی پسند تحریک کی ایک کانفرنس کے صدارتی خطبے میں زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ 'ہمیں اب اپنے حسن کا معیار بدلنا ہوگا' ان کا یہ جملہ ترقی پسند تحریک کا منشور بن گیا۔ اس کی روشنی میں ترقی پسندوں نے شعروادب کے داخلی خدوخال کو متعین کیا۔ کمال کی بات یہ ہے اردو میں ناول کی روایت کو فروغ دینے اور اسے سمت ورفتار عطا کرنے والے ناول نگاروں کا تعلق اتر پردیش سے ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلا نام پنڈت رتن ناتھ سرشار کا لیا جاتا ہے۔ انہوں نے اردو میں کئی ناول تصنیف کئے اور انگریزی کے کئی عمدہ ناولوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار (1846-1903)

کا شمار اردو ناول کو برگ وبار عطا کرنے اور اسے مزاح کی چاشنی سے روشناس کرانے والے فن کاروں میں ہوتا ہے۔ اردو کے کئی ناول ان کے رہین منت ہیں ۔ وہ بلا کے ذہین اور زودنویس فن کار تھے اور رند بلانوش بھی، رندی کی وجہ سے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو نقصان بھی پہنچا۔ وہ لکھنؤ میں 1903 میں پیدا ہوئے لیکن ملازمت کی غرض سے حیدرآباد کا رخ کیا اور وہاں مہاراجہ کشن پرساد کے وظیفہ خوار ہوئے۔ حیدرآباد میں قیام کے دوران انہوں نے اخبار 'دبدبہ آصفیہ' کی ادارت بھی کی۔ حد سے زیادہ شغل مے نوشی کی وجہ سے ان کی صحت برباد ہوگئی اور بالآخر 1846 میں یہیں انتقال ہوا۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار نے تخلیقی زندگی کا آغاز 'اودھ' اخبار سے کیا۔ 1878ء میں انہیں اس اخبار کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ یہیں سے انہوں نے 'فسانہ آزاد' لکھنے کا سلسلہ شروع کیا اور 1880 میں کتابی شکل میں منظر عام پر آیا۔ خداداد صلاحیت اور خلاقانہ ذہنیت کی وجہ سے انہوں نے اردو ادب میں جلد ہی شہرت حاصل کر لی۔ 'جام سرشار (1888)، سیر کہسار (1890) یہ سب ان کے پہلے دور کے ناول ہیں۔ دوسرے دور کے ناولوں میں 'کامنی (1894)، کڑم دھم، بچھڑی دلہن، پی کہاں، اور ہشو، طوفان بدتمیزی' ہیں ۔ یہ چاروں ناول 1894 میں منظر عام پر آئے۔ سرشار کے ناولوں کا تیسرا دور قیام حیدرآباد کا زمانہ ہے۔ اس دور میں انہوں نے 'گورغریباں' کے نام سے ایک ناول لکھا

جو شائع نہیں ہو سکا۔ اور دوسرا ناول 'چنچل نار' ہے، جسے مہاراجہ جے کشن نے اپنے نام شائع کرالیا۔ اس پر عظیم الشان صدیقی نے 'اردو ناول کا آغاز وارتقا' میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ اسپینش رائٹر سر وانٹیز (CERVANTES) کا ناول 'ڈون کوژوٹ' (DONQUIXOTE) کا اردو ترجمہ انہوں نے 'خدائی فوجدار' کے نام سے کیا۔ جو 1891 میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس ناول کی وجہ سے بھی سرشار کو بے پناہ مقبولیت ملی۔ لیکن سرشار کی تمام تصانیف میں شہرت عام اور بقائے دوام 'فسانہ آزاد' کو حاصل ہوئی۔ لکھنوی معاشرت کی عکاسی، طنز کی کاٹ، مزاح کی چاشنی، بیگماتی زبان کے برتنے، محاورے کے استعمال اور خوجی جیسے مزاحیہ کردار کے اختراع کی وجہ سے 'فسانہ آزاد' کا شمار اردو کے قابل ذکر ناولوں میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے 'الف لیلیٰ' کا اردو میں انتہائی فصیح وبلیغ ترجمہ کیا ہے جو بذات خود ایک شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔

رتن ناتھ سرشار کے بعد منشی پریم چند نے اردو ناول کی دنیا میں قدم رکھا۔ انہوں نے اردو فکشن بالخصوص اردو ناول کو زمینی حقیقت اور زندگی کی سچائیوں سے روشناس کرایا۔ ان کی تخلیقات سوندھی مٹی کی خوشبو سے معطر ہیں۔ دیہات کے فطری مناظر کو انہوں نے فنی ہنرمندی کے ساتھ اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔ اپنے گردوپیش کے سیاسی، سماجی حالات، طبقاتی جبر اور طاغوتی نظام کے آمرانہ رویے کو فنی پختگی کے ساتھ برتنے کی وجہ سے ناول نگاری کے اس دور کو پریم چند کے عہد سے موسوم کیا گیا۔ پریم چند نے اردو کا رشتہ امراء وسلاطین کے بجائے عام انسان سے جوڑ دیا۔ بقول رشید احمد صدیقی ''اردو لکھنے والوں میں پریم چند پہلے شخص ہیں جنہوں نے حسن وعشق کو محل سراؤں اور مشاعروں سے نکال کر گاؤں کی چوپال اور چھپروں تک پہنچادیا'' پریم چند نے اردو ناول کو موضوع کی سطح پر زرخیزی عطا کی۔ بقول پروفیسر نورالحسن نقوی ''پریم چند کے جادو نگار قلم سے چھو کر اردو ناول کندن ہو گیا۔''

ان کا اصل نام منشی دھنپت رائے سری واستو ہے، لیکن ادبی دنیا میں پریم چند کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ دھنپت رائے سے پریم چند ہونے کی پوری کہانی دنیائے اردو کے سامنے عیاں ہے۔ (لمہی) بنارس کے منشی عجائب لال کے یہاں 13 جولائی 1880ء میں پیدا ہوئے اور بنارس میں ہی عمر کی 56 بہاریں دیکھنے کے بعد 8 اکتوبر 1936 کو اس دنیائے آب وگل سے ان کی زندگی کا رشتہ منقطع ہو گیا۔ ناول افسانے کے علاوہ انہوں نے کئی ایک ڈرامے بھی لکھے اور ایک عرصے تک ہندی کی مشہور میگزین 'ہنس' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔

پریم چند کے ناولوں کو محققین نے تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور 1902 سے 1912 تک کے عرصے پر محیط ہے۔ اس دور میں انہوں نے 'اسرار معابد، ہم خرما وہم ثواب، جلوۂ ایثار اور بیوہ' لکھے۔ دوسرا دور 1916ء سے شروع ہو کر 1930 پر ختم ہوتا ہے۔ اس عہد میں انہوں نے 'بازار حسن، گوشۂ عافیت، نرملا اور غبن' تصنیف کئے۔ پریم چند کے ناولوں کا تیسرا دور 1934ء سے شروع ہو کر 1936 پر مکمل ہوتا ہے۔ اس دورانیے میں انہوں نے 'چوگان ہستی، پردۂ مجاز، میدان عمل، گئو دان اور منگل سوتر' رقم کئے۔ پریم چند نے اپنے ناولوں میں سماجی حقیقت نگاری کے ساتھ، کردار نگاری پر بھرپور توجہ دی، منظر نگاری بھی ان کے یہاں خوب ہے۔ 'ان کے ناولوں کا تیسرا دور سب سے اہم ہے۔ 'گئو دان' ان کا اہم ناول ہے، جو اسی عہد میں لکھا گیا۔ اس میں پریم چند کا فن ہیئت اور اسلوب کی سطح پر نکتہ عروج پر نظر آتا ہے۔ گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے 'گئو دان' کو اردو کے بہترین ناولوں کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔ ہوری، دھنیا اور گوبر، وغیرہ گئو دان کے جیتے جاگتے کردار ہیں۔ اپنے عہد کے درپیش مسائل کو خوبی کے ساتھ برتنے کی وجہ سے پروفیسر نورالحسن نقوی نے پریم چند کو جدید اردو ناول کا بانی قرار دیا ہے۔

پریم چند کی شعوری کوششوں کی وجہ سے نہ صرف اردو ناول کی کائنات وسیع ہوئی بلکہ انہوں نے اپنے بعد کے ناول نگاروں کے لیے راستہ بھی ہموار کیا۔ پریم چند کے بعد موضوع کی سطح پر ناول کی دنیا وسیع ہوئی ہیئت اور اسلوب کی سطح پر تجربے بھی کئے

مجتبیٰ حسین

اپنی مزاحیہ تحریروں اور طنزیہ جملوں سے ذہن کے دریچوں کو وا کر دینے میں طاق مجتبیٰ حسین کو ہندوستانی طنز ومزاح کا شہنشاہ بھی کہا جاتا ہے۔ اردو ہی کیا دوسری ہندوستانی زبانوں میں بھی ان جیسا مزاح نگار شاید کوئی دوسرا نہیں۔ ادارہ 'نیا دور' مجتبیٰ حسین سے طویل انٹرویو کے ساتھ انکی ہمہ جہت شخصیت اور ان کی ادبی عظمت پر **انیس اشفاق، بیگ احساس، صبیحہ انور، ظفر کمالی، گل رعنا، محسن خان** وغیرہ کے تاثرات کے ساتھ ستمبر ۲۰۱۸ء میں آپ کے روبرو ہوگا۔

گئے۔آج اردو کی تمام اصناف میں ناول کو اس لیے مقبولیت اور محبوبیت حاصل ہے کہ اس میں زندگی اور سماج کی ساری سچائیاں اپنی تمام جہتوں کے ساتھ روشن ہیں۔اردو ناول کو عوامی جذبات واحساسات سے ہم آہنگ کرنے اور اسے قبول عام کا درجہ دلانے میں پریم چند کی کوششوں کا عمل دخل سب سے زیادہ ہے۔ پریم چند کے علاوہ اتر پردیش کے بہت سے غیر مسلم ناول نگار ہیں جن کی خدمات کا جائزہ اختصار کے ساتھ لیا جائے گا۔

اردو ناول کے ضمن میں ایک نام نوبت رائے نظر لکھنوی کا بھی لیا جاتا ہے۔نظر لکھنؤ میں 1816ء منشی الفت رائے کے یہاں پیدا ہوئے۔تین سال کی عمر میں شفقت پدری سے محروم ہو گئے ،تو دادا منشی خوش وقت رائے نے آپ کی تربیت اور کفالت کی۔نوبت رائے نظر کا انتقال 10 اپریل 1923 میں ہوا۔شاعری اور نثر دونوں میں آپ کو ملکہ حاصل تھا۔اردو میں آپ نے 'بگڑے نواب، (1896) حسین رانی اور 'عروج وزوال' (1902) کے نام تین ناول تصنیف کئے۔اس کے علاوہ انگریز رائٹر جارج ولیم رینالڈز کے ایک ناول کو 'شام جوانی' کے نام سے دو جلدوں میں اردو میں منتقل کیا جو نول کشور پریس لکھنؤ سے چھپ کر 1938ء میں منظر عام پر آیا۔

نوبت رائے نظر کے ناول 'بگڑے نواب' میں لکھنؤ کی معاشرت ،نوابین کے مشاغل اور جعل سازوں کی کارستانیوں کے دلچسپ مرقعے دیکھے جاسکتے ہیں۔'عروج وزوال' ان کا تاریخی ناول ہے جس میں پرتھوی راج اور جے چند کے اختلافات کو پیش کرنے کے علاوہ شہاب الدین غوری کی معرکہ آرائیوں کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔فنی اعتبار سے یہ ایک کمزور ناول ہے۔

'انوار نظر' کے نام سے آپ کی غزلوں کا مجموعہ 1965ء میں شمع بک ڈپو آصف علی روڈ نئی دہلی سے شائع ہوا۔آپ کے دیوان کا ایک انتخاب حسرت موہانی نے مرتب کر کے 'رئیس المطالع' کانپور سے شائع کرایا۔اس کے علاوہ صحافت سے بھی آپ کو دلچسپی تھی۔کئی ماہنامے اور روزنامے میں آپ نے ادارت کے فرائض انجام دیے۔جن میں رسالہ 'خدنگ نظر، زمانہ کانپور، تفریح لکھنؤ، ادیب لکھنؤ ، روزنامہ ون مین، اور روزنامہ اودھ قابل ذکر ہیں۔

اردو کے غیر مسلم ناول نگاروں میں جوالا پرشاد افق کو اس طور سے اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے شرر کے طرز پر تاریخی ادراکات کو بروئے کار لاتے ہوئے تاریخی شخصیتوں کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔افق 1864ء میں منشی پورن چند ذرہ کے یہاں پیدا ہوئے۔آپ ایک اچھے شاعر اور عمدہ نثر نگار تھے۔ شعری دسترس کی وجہ سے آپ کو ملک الشعرا کے خطاب سے نوازا گیا۔لکھنؤ میں 12 ستمبر 1913 کو انتقال ہوا۔آپ نے اردو کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کی۔آپ مؤرخ ،مترجم کے علاوہ ڈرامہ نگار بھی تھے۔مزاح وظرافت نگاری کے علاوہ میدان صحافت میں بھی اپنی فعالیت کا ثبوت پیش کیا۔آپ نے ناول نگاری کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی۔'طلسم ،فتنہ، کادمبری، شاہزادی، اورنگ زیب ،اور شیواجی 'ان کے ناول ہیں۔ان کے ناولوں کا مزاج رومانی اور تاریخی ہے۔ان ناولوں میں مصنف کے تاریخی شعور کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

پنڈت کشن پرشاد کول اکتوبر 1885 میں مین پوری کے پنڈت کامتا پرشاد کول کے یہاں پیدا ہوئے ۔آپ کشمیری النسل ہیں۔آپ کو اردو سے خاص لگاؤ تھا۔ریاستی اور ملکی سطح پر انجمن ترقی اردو ہند کے ذمہ دار بھی رہے۔زندگی بھر مجاہد اردو کے طور پر اس کا جائز حق دلانے کے لیے کوشاں رہے ۔آپ کی تحریر کا اسلوب سادہ اور عام فہم ہے ۔آپ نے اردو میں 'قربانی اور نشا' کے نام سے دو ڈرامے بھی لکھے لیکن ادبی حلقے میں ناول نگار کے طور پر زیادہ شہرت پائی۔13 جنوری 1955 میں آگرہ میں آپ کا انتقال ہوا۔کرشن پرشاد کول نے اردو میں تین ناول لکھے۔' شاما، مجبورِ وفا، سادھو اور بیسوا' علی عباس حسینی کے قول کے مطابق 'سادھو اور بیسوا' ایک انگریزی قصہ سے ماخوذ ہے جبکہ 'شاما' ان کا طبع زاد ناول ہے۔

پنڈت کرشن پرشاد کول اردو ناول نگاری کے میدان میں ایک باغیانہ تیور کے ساتھ داخل ہوئے ،ان کے سبھی ناولوں میں ان کے اس باغیانہ ذہن کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ان کے تینوں ناولوں میں 'شاما' کو سب سے زیادہ شہرت ملی۔ان کا یہ ناول 1917 کے آس پاس منظر عام پر آیا۔ان کے ناولوں کی فضا رومانوی ضرور ہے ،لیکن ان میں ایک ٹھوس سماجی حقائق کا ردعمل بھی ہے۔ان کا یہ ناول ایک تاریخی تناظر میں لکھا گیا ہے۔آزادی سے قبل مسز اینی بیسنٹ کے سیاسی، سماجی اور اصلاحی کوششوں کے اثرات سماج پر مرتسم ہو رہے تھے۔'شاما' کے کردار میں بھی یہ ساری خوبیاں نظر آتی ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کردار کا تانا بانا اینی بیسنٹ کی شخصیت کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے۔کیونکہ اس میں مسز اینی بیسنٹ کی گرفتاری کا ذکر ہے۔اس ناول میں خواتین پر فرسودہ جکڑ بندیوں اور ان پر ہو رہے سماجی استحصال کے خلاف ایک آواز بلند کی گئی ہے۔وہ تمام بے جا رسوم وقیود جو اس زمانے میں خواتین پر روا تھے، ان کے خلاف 'شیاما' ایک احتجاج ہے۔'شیاما' کو اردو ناول میں عمدہ کردار نگاری اور خاندانی نظام کی اہمیت پر زور دینے اور اپنے اندر سماجی مباحث کے مختلف پہلوؤں کو سمیٹنے کی وجہ سے اہم مقام حاصل ہے۔'شیاما' کے کردار کو پنڈت کرشن پرشاد کول نے مثالی کردار کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ڈاکٹر احسن فاروقی شیاما کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔

''پنڈت کشن پرشاد کول کا 'شاما' ایک ہندو

بیوہ کا مثالی کردار ہے۔ ہندو بیوہ کہاں تک جاسکتی ہے اور کہاں اس کا مذہبی پابندیوں کی وجہ سے رک جانا ضروری ہوتا ہے، اس پورے عمل کا مکمل تخلیقی اظہار اس ناول میں ملتا ہے۔ بیسویں صدی کے شروع میں متوسط طبقہ کے ہندو گھرانوں اور خصوصاً کشمیری پنڈتوں کے خاندانوں کا بڑا اچھا نقشہ اس میں پیش کیا گیا ہے۔''

رام بہادر لال جویا کا تعلق آنولہ، ضلع بریلی، اتر پردیش سے ہے۔ جویا منشی رام غلام کے یہاں 1875ء میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک صاحب دیوان شاعر کے علاوہ عمدہ نثر نگار بھی تھے۔ نثر میں 'ارمغان اردو' کے علاوہ 'پیراہن یوسفی' کے نام سے آپ نے ایک ناول بھی لکھا۔ شاعری میں 'یادگار جویا' کے نام سے آپ کے ایک دیوان کا ذکر بھی ملتا ہے۔ آپ کے ناول کے نام سے ظاہر ہے کہ اس میں یوسف وزلیخا کے رومانی قصے کو تخیل کی آمیزش کے ساتھ فکشن کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔

منشی سکھ دیال شوق کا تعلق خورجہ بلند شہر (اتر پردیش) سے ہے۔ انہوں نے ایک معاشرتی ناول 'دل ربا' کے نام سے لکھا جو 1992 میں میور پریس دہلی سے شائع ہوا۔ ناول سے متعلق خود ناول نگار کی رائے ملاحظہ کریں۔

''ایک حسرت نصیب کی پردرد کہانی ،عاشق دل فگار کی افسوسناک سرگزشت، پاک دامن بی بی کا اندوہناک ماجرا، کلیجوں میں ناسور ڈال دے وہ بیان حسن پرستوں کو بے چین کردینے والا قصہ جسے ایک نظر دیکھ کر دنیا میں ختم کئے بغیر کوئی نہیں رہ سکتا۔'' یہ ناول میاں بیوی کے تعلقات کو مدنظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔ ناول کے پلاٹ اور کردار کے تعلق سے عظیم الشان صدیقی لکھتے ہیں ''اس ناول کا پلاٹ کسی قدر پیچیدہ ہے لیکن اس میں کوئی جاندار کردار نہیں ہے۔''

خورجہ (بلند شہر) کے رئیس منشی سکھ دیال شوق نے ناول کے طرز پر وال میک رامائن سے کچھ منتخب واقعات کو بنیاد بنا کر 'کش کندھا کانڈ، اور، بال کانڈ' کے نام سے دو کتابیں لکھیں جو برن پرکاش بلند شہر سے 26 اگست 1997ء کو شائع ہوئیں۔ شوق کی یہ دونوں کتابیں اسلوب اور زبان و بیان کے اعتبار سے انشا پردازی کا بہترین نمونہ معلوم ہوتی ہیں۔

ناول کے باب میں جوالا پرشاد برق کے نام اس طور سے اہمیت کے حامل ہیں کہ انہوں نے دوسری زبانوں کے کئی بہترین ناولوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ان کے ترجمے کی وجہ سے اردو میں ناول نگاری کے رجحان کو فروغ ملا اور بہت سے لوگ ان کے ترجمے سے تحریک پا کر اردو میں ناول نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ پروفیسر نورالحسن نقوی نے ان کے ترجمے کو اردو ناول کے باب میں ایک اضافے سے تعبیر کیا ہے۔ انہوں نے بنگالی کے معروف رائٹر بنکم چند چٹرجی کے ناول 'چودھری دیورانی' کا اردو ترجمہ 'بنگالی دولہن' کے نام سے کیا۔ اس کے علاوہ بنکم چٹرجی کے دوسرے ناول 'مرنالنی' کا ترجمہ اسی نام سے اور کرشن کانت کا ترجمہ 'روہنی اور شمع محفل' کے نام سے کیا۔ جوالا پرشاد برق اردو میں ترجمہ نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں لیکن عظیم الشان صدیقی نے 'اردو ناول--آغاز وارتقا' میں پنڈت جوالا پرشاد برق کے چار طبع زاد ناولوں کا ذکر کیا ہے جن کے نام اس طرح ہیں۔ 'مارآستین ،فیروز گلنار، معشوقہ فرنگ ،اور پرتاب'۔ جوالا پرشاد برق 21 اکتوبر 1862 کو لکھیم پور میں پیدا ہوئے اور 26 مارچ 1911 کو لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

پنڈت بشمبر ناتھ فیض آباد (اودھ) کی اور لکھیم پور کھیری میں برٹش عہد میں منصرم عدالت تھے۔ اردو میں انہوں نے ناول بھی لکھے اور اور بہت سے انگریزی ناولوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ 'سراب حیات' ان کا طبع زاد ناول ہے، جو 1876ء میں ہندوستان پریس امرتسر پنجاب سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ انہوں نے جارج ڈبلیو ایم رینالڈز کے ایک انگریزی ناول کا اردو بامحاورہ ترجمہ 'فسانہ عشق' کے نام سے کیا جو منشی نول کشور پریس لکھنؤ سے 1924ء میں منظر عام پر آیا۔

منشی سرن شنکر نے 'مہارانی پدمنی' کے نام سے ایک ناول لکھا، کتابوں میں صرف اس کا ذکر ملتا ہے۔ عظیم الشان صدیقی نے اس کا ذکر کیا ہے، اس کی تفصیلات دستیاب نہیں ہوسکیں۔ سرن شنکر کا تعلق اتر پردیش کے آگرہ سے تھا۔

منشی پنڈت گوری شنکر پرشاد ہمدم اکبرآبادی کا ناول 'امید وصال' کے نام سے 1902 میں منظر عام پر آیا۔ اس کے علاوہ ان کے تین اور ناول 'خارِغم، سرمۂ بصیرت' اور 'ایران کا شہزادہ' کے نام سے زیور طبع سے آراستہ ہوئے۔ مؤخر الذکر ناول ابوالعلائی پریس آگرہ سے اشاعت پذیر ہوا۔ یہ ایک مختصر ناول ہے جو 92 صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے ایک تاریخی وقوعے کو بنیاد بنا کر ناول کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ فردوسی کے کردار کو اس ناول میں مرکزیت حاصل ہے۔ ہمدم اکبرآبادی نے لکھنؤ میں برطانوی عہد حکومت میں عدالت خفیفہ میں بحیثیت جج اپنی خدمات انجام دی۔ انہوں نے آٹھ صفحات پر مشتمل ایک مثنوی بھی لکھی جو 1911 میں مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سے 'مثنوئ بہار' کے نام سے منظر عام پر آئی۔

'عجوبہ' کے خالق منشی شنبھو دیال بدر ہیں۔ 68 صفحات پر مشتمل ان کا یہ ناول 1326 ہجری میں مطبع دبدبۂ احمدی مشک گنج لکھنؤ سے شائع ہوا۔ لکھنؤ کی شستہ زبان میں ایک عبرت انگیز ناول جس میں ایک نمک حرام خادمہ نے اپنی قدامت کی ٹٹی کو بھروسے کی آڑ بنا کر مخدومہ کی کمسن حسین لڑکی کو نوجوانی کی گمراہیوں کا شکار کیا۔ ناول کے آخری صفحے پر محمد عبدالرؤف عشرت کا ایک منظوم تبصرہ بھی شامل ہے جس

میں زبان و بیان کی عمدگی پر زور دیا گیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اعداء بھی شنبھو دیال کی ناول کی اہمیت کے قائل ہے۔آخری شعر ملاحظہ کریں:

اعدا سر اپنے اپنے جھکا کر یہ کہہ اٹھے
شنبھو دیال بدر کی تصنیف لاجواب

داستانوی اسلوب اختیار کرنے کی وجہ سے ناول کی زبان ثقیل اور پرتکلف ہوگئی ہے ،لیکن اس زمانے میں یہی اسلوب مقبول اور مروج تھا۔کردار کی بات کریں تو ثریا بیگم ،دل بہار،نواب رائے ،شمشاد مرزا،رقیہ بیگم ناول کے اہم اور جیتے جاگتے کردار ہیں لیکن تمام میں مدن اور عجوبہ کو مرکزیت حاصل ہے۔

لکھنؤ کے رہنے والے منشی موہن لال فہم نے بھی کئی معاشرتی اور تاریخی ناول تصنیف کئے ہیں۔تلاش بسیار کے باوجود ان کے سوانحی کوائف سے متعلق جانکاری دستیاب نہیں ہوسکی۔فتنہ (مطبع رائے صاحب منشی گلاب سنگھ پریس لکھنؤ)'اندر موہنی' جو 1916 میں اودھ اخبار میں قسط وار شائع ہوا اور کافی پسند کیا گیا۔لیکن یہ ناول کتابی صورت میں لکھنؤ میں واقع نول کشور پریس سے 1918ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ایک کم سن شادی شدہ لڑکی اگر بیوہ ہوجائے تو سماج میں اسے کتنی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ناول 'رمبھا' میں یہی دکھایا گیا ہے۔(اشاعت نول کشور پریس لکھنؤ 1928)'زبردستی کا خون ،اور مستانی جوگن' بھی ان کے معاشرتی ناول ہیں ،جو فنی اعتبار سے ناقص اور کمزور ہیں۔ناولوں کے علاوہ انہوں نے'اورنگزیب عالم گیر اور چنچل کماری' اور 'ٹرکی حرم سرا' کتابیں تصنیف کیں۔یہ دونوں تاریخی نوعیت کی ہیں۔موخرالذکر کتاب میں ترکی کی معاشرتی خرابیوں کو بیان کیا گیا ہے۔

اپیندر ناتھ اشک نے 14d دسمبر 1910 کو جالندھر میں پنڈت مادھو رام کے یہاں آنکھیں کھولیں ۔1936 میں لاہور کے ایک کالج سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد سے کسب معاش کے لیے امرتسر،لاہور،ممبئی اور دہلی کا رخ کیا لیکن کہیں بھی دلجمعی کے ساتھ قیام نہیں کر سکے بالآخر 1948 میں الہ آباد کا رخ کیا، یہاں انہوں نے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا اور عمر بھر کے لیے یہیں کے ہوکر رہ گئے اور یہیں 19 جنوری 1996 کو پیوند خاک بھی ہوئے۔

اپیندر ناتھ اشک کی ادبی اور تخلیقی زندگی چالیس برسوں پر محیط ہے ۔شعر و ادب سے ان کو گہرا لگاؤ تھا۔انہوں نے افسانے ،ناول،ڈارمے لکھے اور شاعری میں بھی طبع آزمائی ۔ان کے دس افسانوی مجموعے اور چھ ناول منظر عام پر آئے۔فکری اعتبار سے وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ان کے ناولوں کے نام ہیں۔ستاروں کے کھیل (1937) گرتی دیواریں (1947) اور گرم راکھ (1952) پتھر پتھر ،بڑی بڑی آنکھیں اور ایک ننھی قندیل۔'

اپیندر ناتھ اشک ایک معروف ناول نگار ہیں۔ان کا مشاہدہ اور مطالعہ گہرا ہے۔انہوں نے اپنے ناولوں میں کرداروں کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو پیش کیا ہے۔ان کی تخلیقات میں سماجی اور طبقاتی فرق بھی نمایاں ہے۔سماجی کرب اور حالات کے جبر کو بھی انہوں نے آئینہ دکھایا ہے۔پس ماندہ طبقات کی بے بسی، بے چارگی ،اندھی اور کوری تقلید،اور سماجی خرابیوں کو انہوں نے بیان کرنے کی کوشش کی ہے ۔ان کے یہاں رومانیت اور جذباتیت کی آمیزش بھی نظر آتی ہے۔اپیندر ناتھ اشک کو اردو اور ہندی دونوں زبانوں پر یکساں عبور حاصل تھا۔ان کا ناول 'گرتی دیواریں' پہلے ہندی میں (1947) پھر اردو میں (1948) میں شائع ہوا۔'گرتی دیواریں' کے چھ حصے اردو میں مختلف ناموں سے منظر عام پر آئے۔تخلیقی ہنرمندیوں سے واقفیت کے باوجود کہیں کہیں ان سے چوک ہوگئی ہے۔ضروری طوالت اور بے جا جزئیات نگاری کی وجہ سے ناول میں کہیں کہیں اکتاہٹ کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔'گرتی دیواریں' کے تعلق سے ڈاکٹر نگینہ جبیں لکھتی ہیں۔

''ناول کی بے جا طوالت واقعات کے ٹکراؤ،اور کہیں کہیں دہراؤ،چیتن کے بچپن کی غیر ضروری تفصیلات اور بے ضرورت خاکہ نگاری کی وجہ سے ناول کا بیانیہ کشش اور تناسب کو مجروح کردیتی ہے۔جس سے ناول میں ایک تھکادینے والی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور قاری پر بے کیفی پیدا ہونے لگتی ہے۔''

'گرتی دیواریں' سماج کی فرسودہ روایات پر کاری ضرب لگاتا ہے۔اس میں اوپیندر ناتھ اشک کی ترقی پسندی پر رومانویت غالب ہے۔ناول کا ہیرو جذبۂ محبت میں اس حد تک سرشار ہے کہ وہ ذہنی توازن بھی کھو بیٹھتا ہے۔'گرتی دیواریں' کے تعلق سے علی عباس حسینی نے بڑی صحیح بات کہی ہے جس کا اعادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔''ستاروں کے کھیل میں ترقی پسندی کم ہے،رومانویت زیادہ ہے۔ہیرو کا وفور محبت سے توازن دماغی کا کھو بیٹھنا، پرانی بوتل میں نئی شراب پیش کرنا ہے۔مجنوں وہی قدیم ہے،صرف اس نے بیسویں صدی کا جدید لباس پہن لیا ہے! پھر بھی یہ ناول موجودہ معاشرے کی روایات پر کافی تیز ضرب لگاتا ہے اور ہمیں یہ غور کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ اس طرح کے المیہ واقعات کے انسداد کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں۔''

شنکر سروپ بھٹناگر غیر منقسم اتر پردیش کے دہرادون میں رام چندر بھٹناگر کے یہاں 4 ستمبر 1920 میں پیدا ہوئے ۔تلاش معاش کے سلسلے میں دہلی آئے اور باقی ماندہ زندگی یہیں گزار دی۔انہوں نے تین ناول تصنیف کئے۔'اندھیرے دور تک' (1983) یہ ایک سماجی ناول ہے۔اس میں سماج میں پھیلے ظلم و جبر،ناانصافی اور بدعنوانی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ان کا دوسرا ناول 'پرموشن' (1984) میں منظر عام پر آیا۔اس میں بھی سماجی بدعنوانی کو ہی پیش کیا گیا ہے۔سرکاری دفاتر میں کام کرنے والے ملازمین کو

اپنے پرموشن یا ترقی کے لیے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، وہاں کے بہت سے ملازمین پرموشن کی چاہ میں اسی گریڈ پر ملازمت سے سبکدوش بھی ہوجاتے ہیں ،جن پران کی بحالی ہوتی ہے یا پھر وہ ملازم جس کا کوئی اثر ورسوخ یا کوئی سیاسی بیک گراؤنڈ نہ ہو، تو اسے اپنی ترقی کے لیے کن کن مرحلوں سے گزرنا ہوتا ہے۔ باس کی کتنی خاطر داری کرنی پڑتی ہے۔ یہ ناول دراصل سماج کے اسی مکروہ چہرے کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ یہ ناول ایک ایسے کلرک کی کہانی کی ہے جسے اپنی ترقی کے لیے دفتر میں بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔شنکر سروپ بھٹناگر کا تیسرا ناول 'توبہ' ہے۔اس اشاعت 1986 میں عمل میں آئی۔اس میں جہیز کی تباہ کاریوں کو پیش کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ جہیز ایک ناسور ہے جس کی وجہ سے ہمارے سماج کی بہت سی بیٹیاں غربت وافلاس کی وجہ سے پوری عمر شادی کی منتظر رہتی ہیں یا پھر موت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔

رام لعل چھابڑہ جواد بی حلقوں میں رام لعل کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ان کے والد کا نام لچھمن داس چھابڑہ ہے۔ان کی پیدائش 3 مارچ 1923 کو میاں والی (پاکستان) میں ہوئی۔ریلوے کے محکمے میں ملازمت کی 1981 میں ریٹائرمنٹ کے بعد لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کی اور یہیں 16 اکتوبر 1996 میں انتقال ہوا۔آپ کو اردو زبان سے بہت لگاؤ تھا، اردو کے فروغ سے متعلق کئی تنظیموں اور تحریکوں سے آپ ایک متحرک کارکن کے طور پر وابستہ رہے۔انہوں نے پورے اتر پردیش میں اردو کی بہتری کے لیے مہم چلائی اور اردو کی ترقی کے لیے زندگی بھر کوشاں رہے۔

رام لعل کا مطالعہ وسیع اور ان کا مشاہدہ گہرا تھا۔محکمہ ریلوے میں ملازمت کی وجہ سے ہندوستان کے مختلف شہروں کے خوب اسفار کئے۔اس کے علاوہ آپ نے پاکستان، یوروپ اور ماسکو کے بھی اسفار کئے اور سفرنامے بھی لکھے۔سفرنامہ پاکستان 'زرد پتوں کی بہار' (1982) 'یوروپ کا سفرنامہ 'خواب خواب سفر' ناروے، سویڈن، انگلینڈ، ڈنمارک (1982) ماسکو کا سفرنامہ 'ماسکو یاترا' (1990) کے نام سے اشاعت پذیر ہوا۔افسانے اور ناول کے علاوہ 'اردو افسانے کی نئی تخلیقی فضا' (1985) کے نام سے آپ کی ایک تحقیقی اور تنقیدی کتاب بھی منظر عام پر آئی۔روزنامہ 'عالم' لکھنؤ میں بطور ایڈیٹر بھی آپ نے کام کیا۔'دریچوں میں رکھے چراغ' کے نام سے انہوں نے ادبی شخصیات کے خاکے بھی لکھے۔'کوچہ قاتل' (1993) کے نام ان کی خودنوشت (سوانحی ناول) بھی شائع ہوئی۔'کوچہ قاتل' کا سب سے اہم کردار خود مصنف ہے۔اس کا کینوس تقسیم ہند کے بعد ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اور بڑے پیمانے پر ہجرت اور نقل مکانی تک پھیلا ہوا ہے۔بقول ڈاکٹر نگینہ جبیں ''یہ ناول خودنوشت سوانح حیات ہی نہیں بلکہ 1947 کی فرقہ واریت کی ایک جیتی جاگتی دستاویز بھی ہے..... 'کوچہ قاتل' مصنف کی سرگزشت حیات کے ساتھ ایک تاریخی حقیقت بھی ہے، جو بڑے سلیقے سے ناول کی شکل میں صفحہ قرطاس پیش کردی گئی ہے۔''

ناولوں کی تعداد چھ ہے، 'کہرا اور مسکراہٹ (1972) مٹی بھر دھوپ (1973) نیل دھارا (1981) سورج جیسی رات (1984) چاچی کا ڈھابہ (1996) جبکہ 'آگے اور پیچھے' (1994) ان کے دو ناولٹ ہیں۔ ان کے ایک درجن سے زائد افسانوی مجموعے بھی زیور طباعت سے آراستہ ہوئے۔

رام لعل کی تخلیقی اور تصنیفی سرگرمیوں پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ قلم اور کتابوں کے درمیان گزرا۔ان کا تصنیفی دائرہ کافی وسیع ہے۔اردو میں افسانہ ان کی شہرت اور شناخت کا روشن ترین حوالہ ہے لیکن انہوں نے اردو میں ناول بھی تصنیف کئے ہیں۔ان کے ناولوں میں تحیر اور تجسس کے ساتھ ساتھ رومانی تصور بھی کارفرما ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں زندگی کی چھوٹی چھوٹی باریکیوں کو کرداروں کے توسط سے بیان کیا ہے۔رام لعل نے انسانی زندگی کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور اس دھوپ چھاؤں سے خوب واقف ہیں جو انسان کو کبھی دکھ دیتی ہے تو کبھی سکھ۔رام لعل کے ناولوں کی دلکشی کا راز ان کی دلچسپ شیریں زبان بھی جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔کرداروں پر بھی وہ خوب توجہ دیتے ہیں ان کی نظر کرداروں کے ذہن پر مرکوز رہتی ہے اور تخلیق کے دوران وہ ایک ایک کر کے اپنے کرداروں کے ذہنوں کی گرہوں کو وہ کھولتے جاتے ہیں۔کہانی کی پیشکش اور پلاٹ کی منطقی ترتیب کی وجہ سے ان کے ناول فن کی کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں اور قارئین میں پسند بھی کئے جاتے ہیں۔

بلونت سنگھ جون 1921 میں گوجرانوالہ (پاکستان) میں پیدا ہوئے ،لیکن انہوں نے اپنی زندگی کا آخری عرصہ الہ آباد میں گزارا اور یہیں 27 مئی 1986 میں پیوند خاک بھی ہوئے۔ان کے والد کا انام جسونت سنگھ تھا۔تقسیم ہند سے پہلے ہی اپنی تخلیقی ہنرمندی کی وجہ سے جن افسانہ نگاروں نے ادبی حلقے میں خاطر خواہ شہرت حاصل کی ان میں ایک نمایاں نام بلونت سنگھ کا بھی شامل ہے۔انہوں نے افسانے بھی لکھے لیکن بطور ناول نگار ان کو زیادہ مقبولیت ملی۔ان کے افسانوں اور ناولوں میں پنجاب کی سوندھی مٹی کی خوشبو شامل ہے۔پنجاب کی تہذیب وثقافت اور وہاں کی طرز معاشرت کو انہوں نے اپنے ناولوں میں فنی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

بقول نورالحسنین ''بلونت سنگھ بنیادی طور پر اردو کے ادیب تھے لیکن معاشی بدحالی نے انہیں ہندی کی طرف راغب کردیا تھا، کیونکہ ہندی رسالے لکھنے والوں کو معاوضہ بھی دیا کرتے تھے۔''بلونت سنگھ نے اردو ناول نگاری کے باب میں کافی شہرت حاصل

کی۔'ایک معمولی لڑکی،عورت اور آبشار،رات چور اور چاند،ان کی بہترین ناول سمجھے جاتے ہیں۔'رات چور اور چاند'(1961) کا شمار اردو کے اہم ناولوں میں ہوتا ہے۔انہوں نے یہ ناول اس وقت لکھا جب اردو میں اینٹی ہیرو کا کوئی تصور نہیں۔ ناول کی فضا رومانی ہے۔اس میں پنجاب کا کلچر پوری طرح سانس لیتا نظر آتا ہے۔اس میں پنجاب کا اکھڑ پن بھی نظر آتا ہے اور وہاں کے حسن و جمال کی دلآویزی بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔اس ناول پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر راشد انور راشد لکھتے ہیں۔''اینٹی ہیرو کی امیج کو بلونت سنگھ نے اس وقت (1984) میں پیش کیا جب روایتی انداز سے ہٹ کر کہانیاں لکھنے کا رواج نہیں ہو پایا تھا۔اس حد تک موضوع کے اعتبار سے'رات، چور اور چاند' کی اپنی انفرادیت ہے۔زبان و بیان کے معاملے میں بلونت سنگھ کو غضب کا ملکہ حاصل تھا۔اس ناول کے ہر صفحے پر اس کی مثالیں موجود ہیں۔ٹریٹ منٹ اور اپروچ کی سطح پر بھی یہ ناول ہمیں متاثر کرتا ہے تایا ہری پرساد،کرم الدین وغیرہ کے کرداروں کو گاؤں کے پس منظر میں پوری طرح ابھارا گیا ہے۔جوالا سنگھ اور ڈاکوؤں کی جماعت سے کہانی میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔چنو (بظاہر جوالا سنگھ کی بہن بباطن کی رکھیل) کا کردار بھی اہم ہے۔سرنوں کی سہیلی رکھی کہانی کے بکھرے ہوئے تارو پود کو جوڑنے میں کامیاب ہے ۔مٹی سے جڑی ایسی کہانیاں ہمیں ہر موڑ پر زندگی کی حقیقتوں کا احساس کراتی ہیں۔'' سرنوں،لیفٹیننٹ پرتھی پال،جنداں، پالا سنگھ ڈنگا،ڈاکو سنتا سنگھ ،شہباز خاں ،زرینہ، جمال،رحیم خاں ، اسماعیل اوشا اور کیلاش بلونت سنگھ کے مذکورہ تینوں ناولوں کے معروف اور متحرک کردار ہیں۔ ناول 'رات چور اور چاند' کا تھیم مختصر ہونے باوجود کمال کا ہے کہ انہوں نے چھوٹے سے پلاٹ پر ایک ضخیم ناول رقم کر دیا۔اس ناول کی وجہ سے ان کا شمار معتبر ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔رومانی فضا اور رومانی ماحول کے باوجود ناول حقیقت سے بہت حد تک قریب معلوم ہوتا ہے۔

ستیش بترا کا شمار اردو کے معتبر افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے ۔ان کے یہاں موضوعاتی تنوع ہے ۔انہوں نے اپنے افسانوں میں زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں کا احاطہ کیا ہے۔اردو کے ساتھ ساتھ ہندی اور انگریزی میں بھی ان کے افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ہندی اور انگریزی میں ایک ایک اور اردو میں ان کے پانچ افسانوی مجموعے اشاعت پذیر ہوئے ،جبکہ 'پرچھائیوں کے دیش میں' کے نام سے 1971 میں اردو میں ان کا ایک ناول 'اسٹار پبلی کیشنز نئی دہلی' کے زیر اہتمام منظر عام پر آیا۔ان کا یہ ناول فلمی زندگی سے متعلق ہے۔یہ ایک رومانی ناول ہے جس میں عشق و محبت کے لطیف جذبے کو پیش کیا گیا ہے۔فن کی کسوٹی پر ان کا یہ ناول کھرا نہیں اترتا۔ستیش بترا جہلم (پنڈ دادن) میں 1926 میں پیدا ہوئے ۔اعلی تعلیم کے لیے آگرہ کا رخ کیا ۔وہاں سینٹ جانسن کالج سے انگریزی میں امتیازی نمبرات سے ایم اے کیا۔لکھنؤ اور الہ آباد میں ملازمت کی ضرورت اور تجارت کی مشغولیت کے تحت طویل قیام رہا لیکن مستقل سکونت فرید آباد میں اختیار کی اور وہیں 18 جنوری 1988 کو ان کا انتقال ہوا

رتن سنگھ اردو کے معروف اور معتبر اور محترم فکشن نگار ہیں۔نثر کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی ان کی تخلیقی جدت اور انفرادیت نمایاں ہے۔ادبی حلقے میں بطور افسانہ نگار ان کی اہمیت مسلم ہے ۔نصف درجن سے زائد ان کے افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ 'سانسوں کا سنگیت (2011) کے نام سے انہوں نے ایک ناول بھی لکھا ہے۔وہ پنجاب کے رہنے والے ہیں لیکن برسوں سے نوئیڈا (اتر پردیش) میں مقیم ہیں۔

اتر پردیش سے متعلق اردو کے غیر مسلم ناول نگاروں کی اس مختصر فہرست پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو ناول کے باب میں غیر مسلم فن کاروں کی خدمات انتہائی وقیع ہیں۔یہ ایک تحقیق طلب موضوع ہے،اس پر سنجیدگی اور یکسوئی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔میں نے بساط بھر کوشش کی ہے،لیکن اس کے باوجود اس کی کلیت کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا ۔ممکن ہے بہت سے ناموں تک ہماری رسائی نہ ہوسکی ہو۔اتر پردیش کے غیر مسلم ناول نگاروں کی تخلیقی انہماک اور فنی نکتہ رسی کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی کوششوں کی وجہ سے موضوع اور اسلوب کی سطح پر اردو ناول کا دائرہ وسیع ہوا اور وہ دوسری اصناف کا ہم پلہ قرار پایا۔

آزادی سے قبل وہ مراکز جو اردو ناول کی اشاعت کے لیے فصل بہار کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں لکھنؤ ،دہلی ،آگرہ ،کانپور اور لاہور کو مرکزیت حاصل تھی۔ یہ اور بات کہ امرتسر، فیروز پور، سیالکوٹ ،میرٹھ، گورکھپور، مراد آباد، عظیم آباد، مرشد آباد، کلکتہ ،حیدر آباد، اور ممبئی میں بھی بہت سے اشاعتی ادارے تھے جو اردو ناول کو ترجیحی طور پر چھاپتے تھے۔ناشروں میں منشی نول کشور لکھنؤ وکان پور، ڈاکٹر سی سی گھوش لکھنؤ ، بہار گوا اینڈ سنز لکھنؤ، مہا دیو ورما لکھنؤ ،اور خادم التعلیم لاہور، بخشی اینڈ کمپنی کان پور وکلکتہ ،اور نذیر حسین دہلی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں مذکورہ اشاعتی اداروں کے مالکان کی دلچسپی کی وجہ سے بہت سے اردو ناول منظر عام پر آئے جس کی وجہ سے اردو ناول کی دنیا وسیع ہوئی اور اس عہد کے ناول نگاروں نے ہر طرح کے موضوعات کو اپنے ناولوں میں پیش کیا۔خاص طور پر منشی نول کشور کے مطبع سے اردو کی بیش بہا کتابیں اشاعت پذیر ہوئیں۔ان کی ذاتی کوششوں نے اردو کی ترقی و توسیع میں اہم کردار ادا کیا جسے کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

❑❑❑

اردو کے غیر مسلم شعراء کی شاعری میں اسلامی تاثرات

رضیہ پروین
ممتاز پارک، جیل روڈ، رامپور
موبائل: 9457387505

ہمارے ملک ہندوستان میں مختلف مذاہب اور عقائد کے لوگ رہتے ہیں۔مختلف مذاہب اور عقائد یہاں کی گنگا جمنی تہذیب اور رنگارنگ زندگی کا جز ہے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے زبانوں کی بنیاد پر لسانی خطے قائم ہیں۔لیکن اس کثرت کے باوجود ہندوستان میں ہمیشہ سے ایک بنیادی وحدت رہی ہے۔ اس بنیادی وحدت کو متحد رکھنے میں زبانوں کا بڑا اہم رول رہا ہے۔اردو زبان بھی اسی وحدت کو پروان چڑھانے میں پیش پیش رہی ہے۔ اردو زبان سندھ پنجاب اور دکن سے متاثر ضرور ہوئی۔ ہے بلکہ اس کی پرورش و پرداخت میں ان علاقوں کا خاص رول رہا ہے۔لیکن وہ پیدا گنگا جمنی تہذیب اور دوآبے کے حصے سے ہوئی۔ جس میں کھڑی بولی اور برج بھاشا کا اہم حصہ رہا ہے۔ صوفیوں ،سنتوں نے اس تہذیب کو فروغ دیا۔جس کے اثرات سے اردو شعروادب کا خمیر تیار ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ آج سیاست میں مذہبی جنون نے تاریخ کے اوراق پر گرد ڈال کر ہماری ثقافت اور تمدن کے پر نور چہرے کو دھندلا کر دیا ہے۔اردو جیسی نرم خوبصورت اور دلکش زبان ایک طرف صوفیوں کی گود میں کلمہ پڑھتے ہوئے پلی بڑھی تو دوسری طرف مذہبی ہم آہنگی اور رواداری کی انگلی پکڑ کر چلنے کا ہنر سنتوں سے سیکھا ہے۔

جہاں ایک طرف ہندوستانی مذاہب مثلاً ہندو، بودھ، جین ، اور سکھ کی تعلیمات سے مستفیض ہوئی ہے تو دوسری طرف اسلام اور عیسائیت کے اثرات بھی اس پر مرتب ہوئے ہیں۔تبھی تو غالب جیسے عظیم شاعر کو یہ کہنا پڑا ہے۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

اس زبان کی ترویج و ترقی اور اشاعت میں ہمارے غیر مسلم شعرا اور ادبا کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ جنھوں نے وسعت قلبی کے ساتھ اسلامی تعلیمات کو عام کیا۔ بصارت اور بصیرت کے دریچوں کو وا کیا۔ لطافت وحکمت سے شعروادب کے دامن کو روحانیت بخشی۔عرفان وآگہی کے ساتھ ساتھ ثنائے خدا، مدح رسول ، واقعات کربلا ،حق و باطل کی جنگ اور زندگی کے اسرار ورموز کو حمد ،نعت ،مرثیہ ،مثنوی ،غزل ،سلام ،منقبت اور رباعی وغیرہ اصناف سخن کے ذریعہ نا قابل فراموش خدمات انجام دیں۔علمی و ادبی سرمایہ میں مذہبی افکار کے ردوقبول ملتے ہیں۔چکبست جیسے وطن پرست شاعر بھی خدا سے اپنی لو کا اظہار کچھ یوں کیا ہے۔

’لے کر خدا نام چلے گھر سے رام جی‘

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ایک طرف ایک ہندو شاعر اسلام سے اس حد تک متاثر نظر آتا ہے تو دوسری طرف رام اور کرشن کے متعلق بھی کئی مسلم شعرا ان کی عظمت کو سلام کرتے ہیں۔مثلا

’ہے رام کے وجود پر ہندوستاں کو ناز‘

مشہور زمانہ مثنوی گلزار نسیم کے ابتدائی اشعار کا ایجاز واختصار ہماری نگاہ کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔

ہر شاخ میں شگوفہ کاری
ثمرہ ہے قلم کا حمد باری
کرتا ہے ورد زباں یہ یکسر
حمد حق و مدحت پیمبر
پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے
یعنی کہ مطیع پنج تن ہے
ختم اس پہ ہوئی سخن پرستی
کرتا ہے زبان کی پیش دستی

پنڈت دیا شنکر نسیم نے جس عقیدت کے ساتھ ان اشعار کو رقم کیا ہے ایسا لگتا ہے کہ یہ روشنائی سے نہیں بلکہ روشنی سے تحریر کیا گیا ہے۔ان اشعار نے ایسا جادو جگایا کہ خان رشید نے ’’اردو کی تین مثنویاں‘‘ میں لکھا ہے۔

’’اردو بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ لکھنؤ کے کسی مسلمان کے اشعار ہوں۔مثنوی کے ایسے اشعار تھے جنھوں نے عبدالغفور نساخ جیسے تذکرہ نویسوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ پنڈت نسیم مسلمان ہو گئے تھے۔‘‘

(اردو کی تین مثنویاں، خان رشید، صفحہ نمبر ۱۷۸)

اس طرح بے شمار غیر مسلم شعرا نے اسلامی علوم وفنون سے استفادہ کیا ہے اور اس کا اظہار کھلے دل کے ساتھ شعروادب میں کیا ہے۔ بلکہ کہیں کہیں تو عملی ثبوت بھی پیش کیا ہے۔مثلا پریم چند نے بیوہ سے جو شادی کی وہ اسلامی عقائد کا کھلے دل سے اعتراف ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آریہ سماج تحریک نے اس سمت ایک

مثبت قدم اٹھایا۔ پنڈت نسیم تو بہت مشہور و معروف شاعر ہیں چند ایسے شاعر جن کو خاطر خواہ شہرت نہیں ملی ان کی حمد یہ و نعتیہ اشعار پیش ہیں۔

تیری سب پہ کرپا ہے رب الرحیم
تو سب کا ہے داتا تو سب کا کریم
(پریم پال اشک)

کروں پہلے ثنائے ایزد پاک
پئے سجدہ قلم کا جھک گیا سر
رسول اس نے کئے پیدا جہاں میں
زباں اپنی رکھی ان کی زباں میں
ہدایت گمراہوں کو ، کی انہوں نے
خیر ہر نیک و بد سے دی انہوں نے
(شیام سندر لال برق)

لکھوں پہلے حمد خدائے کریم
کہ ہے نام اس کا غفور الرحیم
ہوا عشق کا بھی اسی سے ظہور
کیا یعنی پیدا محمد کا نور
وہ ساقی کو ثر رسول امیں
بنا جنکی خاطر زمان و زمیں
امام رسل ختم پیغمبراں
محب جہاں سرور دوجہاں
ہیں اصحاب اس کے جو والا گہر
عروج فضیلت کے شمس و قمر
(منشی جیالال خستہ)

بے شمار ایسی مثنویاں ہیں مگر اختصار سے کام لیتے ہوئے منشی جیالال خستہ کے اشعار پر گوپی چند نارنگ کا تبصرہ پیش ہے۔

(اردو کے ہندو مثنوی نگار عطاءاللہ پالوی صفحہ ۱۱)

پنڈت ہری چند اختر، تربھون ناتھ رازؔ، تلوک چند محروم، پنڈت بال مکند گوپی ناتھ امن ، پنڈت نوبت رائے نظر، پنڈت امرناتھ آشفتہ دہلوی، بھگوت رائے راحت کاکوروی، مہاراجہ کشن پرساد، پنڈت دتا تر یہ کیفی ، رگھو پتی سہائے فراق گورکھپوری، کالی داس گپتا رضا، اوم پرکاش ساحرؔ چند پرکاش جوہر، بجنوری ، پنڈت دیا پرساد غوری ، اوما شنکر شاداںؔ اشونی کمار

> قصیدہ خالص عربی صنف ہونے کے باوجود فارسی ادب میں زبردست مقبول ہوئی۔ فارسی میں رودکی، منوچہری، ناصر خسرو، خاقانی، انوری، شیخ سعدی اور عرفی شیرازی جیسے شعراء نے قصیدے کی مقبولیت کو دوبالا کر دیا۔ اردو ادب نے فارسی سے ہی قصیدہ کو مستعار لیا۔ محمد قلی قطب شاہ اور ولی دکنی نے اردو قصیدہ کی داغ بیل ڈالی۔ شمالی ہند میں سوداؔ، مصحفیؔ، انشاؔ، مومنؔ، ذوقؔ، غالبؔ اور اس کے بعد منیرؔ شکوہ آبادی، امیرؔ مینائی اور جلالؔ لکھنوی جیسے شعراء نے قصیدہ گوئی میں اپنا نام پیدا کیا۔ دور حاضر میں گمان غالب ہے کہ یہ صنف بحرانی دور سے گزر رہی ہے حالانکہ کولکاتا، حیدرآباد، امروہہ، الہ آباد، فیض آباد، لکھنؤ اور بہار کے کچھ شہروں میں چند شعراء قصیدہ کی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اردو علم و ادب کے حلقوں میں قصیدہ کے تئیں نئی نسل کا رجحان کمیاب ہے۔ ادارہ 'نیا دور' بہت جلد قصیدہ کے فن، روایت اور تاریخ پر ایک شمارہ شائع کرے گا۔ قلمی تعاون درکار ہے۔
>
> **(ایڈیٹر)**

اشرفؔ چند بھان۔ لتا حیا، کرشن موہن مہندر سنگھ بیدی سحر، جگن ناتھ آزاد، پنڈت آنند نرائن ملا، گلزار دہلوی وغیرہ شعرا نے بڑی صداقت و عقیدت کے ساتھ اسلام اور اس کی تعلیمات اور حضور اقدس سے اپنے والہانہ محبت کا اظہار کر خود پر نازاں ہوتے ہیں۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات رحمت العالمین ہے۔ آپ کی مدحت میں غیر مسلم شعرا نے لافانی اشعار کہے۔ خاص کر مہندر سنگھ بیدی سحر نے اس سلسلے میں جو اشعار کہے اس کا حوالہ اکثر و بیشتر دیا جاتا ہے مثلاً۔

ہم کسی دین سے ہوں صاحب کردار تو ہیں
ہم ثنا خوان شہہ حیدر کرار تو ہیں
نام لیوا ہیں ، محمد کے پرستار تو ہیں
یعنی مجبور پئے احمد مختار تو ہیں
عشق ہوجائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں
صرف مسلم کا محمد پہ اجارہ تو نہیں

اسی طرح پنڈت ہری چند اخترؔ لکھتے ہیں۔

سبز گنبد کے اشارے کھینچ لائے ہیں ہمیں
لیجئے دربار میں حاضر ہیں اے سرکار ہم

کرشن موہن نے رسول اقدس سے اپنے والہانہ جذبات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں۔

گرچہ نام و نسب سے ہندو ہوں
کملی والے میں تیرا سادھو ہوں
تیری توصیف ہے مری چہکار
میں ترے باغ کا پکھیرو ہوں

دیکھا جائے تو ہندوستان کے مخلوط معاشرے میں اگرچہ تہذیب و تمدن میں واضح فرق ہونے کے باوجود بھی اہل قلم و فکر کے حلقوں میں رواداری اور محبت کی ایک انوکھی فضا ملتی ہے۔ غیر مسلم شعرا نے اپنے کلام کے ذریعہ مذہبی تعصب سے اوپر اٹھ کر باہمی محبت و یگانگیت کو فروغ دیا ہے۔ جس میں عقیدت، تڑپ اور خلوص موجود ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پنڈت شیوناتھ کیفؔ نے ''مناجاتِ کیف''، منشی للیتا پرشاد نے ''آزارِ محبت'' نالہ خروش'' پنچ پروان چڑھایا۔

اسی طرح واقعات کربلا کو غیر مسلم شعرا نے جس عقیدت واحترام کے ساتھ اپنی اردو زبان میں شاعری کا موضوع بنایا اس کی مثال دوسری زبان میں شاید نہیں ملتی ہے۔ آج بھی اردو ادب میں مرثیہ اپنی الگ ہی شناخت رکھتا ہے۔ حضرت امام حسین کی قربانی اور کربلا میں پیش آنے والے واقعات نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ غیر مسلم شعرا نے بھی اس رنج و الم کو محسوس کیا۔ حسین کی قربانی صرف اسلام یا مسلمانوں کے لئے نہیں تھی بلکہ یہ تو ایک آفاقی پیغام تھا کہ جب بھی حق و باطل میں جنگ ہوگی تو جیت ہمیشہ حق کی ہوگی۔ سچائی کی ہوگی اور یہی پیغام درس گاہ حسین سے ساری انسانیت کو ملا۔ مہاتما گاندھی نے ایک بار کہا تھا:

''میں سب سے زیادہ متاثر امام حسینؑ سے ہوا ہوں۔''

رام پرکاش ساحر لکھتے ہیں۔

ہے حق وصداقت میرا مسلک ساحر
ہندو بھی ہوں شبیر کا شیدائی ہوں

منشی دیو پرشاد ماتھر لکھتے ہیں۔

انسانیت حسین ترے دم کے ساتھ ہے
ماتھر ابھی حسین ترے غم کے ساتھ ہے

دیکھا جائے تو فراق گورکھپوری کی رباعیاں بھی تصوف ومعرفت کا درس دیتی نظر آتی ہیں۔

ہر جلوہ سے ایک درس نمو لیتا ہوں
چھلکے ہوئے جام وسبو لیتا ہوں
اے جان بہاراں تجھ پہ پڑتی ہے جب آنکھ
سنگیت کی سرحدوں کو چھو لیتا ہوں

تلوک چند محروم نے بھی اسلامی علوم کو اپنی رباعیات میں جگہ دی ہے مثال کے طور چند اشعار رباعی کے بطور نمونہ پیش ہیں۔

قائل ہم بھی ہیں دوزخ و جنت کے
معنی کے ہیں معتقد نہیں صورت کے
دوزخ تاریکیاں تیری دوری کی
جنت انوار ہیں تیری قربت کے

اسی طرح پنڈت جواہر ناتھ ساقی نے بھی اپنی رباعیات میں اسلامی علوم کو جگہ دے کر اسلام دوستی اور خلوص وصداقت کا ثبوت پیش کیا ہے۔

ہستی نما دیدہ حیراں سمجھا
تجھ کو دوران بقا خواب پریشاں سمجھا
کفر وایماں کا عجب رنگ ہے نیرنگی میں
یہ وہ نیرنگ ہے کافر نہ مسلماں سمجھا

ان سب کے علاوہ ایسے بہت سے غیر مسلم شعرا جنہوں نے اپنی غزلوں کو حق ومعرفت کے مضامین سے سجایا سنوارا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعرا کے کلام کو بطور نمونہ پیش کیا جارہا ہے۔

یہ اور کچھ بھی ہوں کافر نہیں ہیں تیرے رند
تو بعد جام خدا کا بھی نام لے ساقی
کہو یہ خضر سے بھٹکے نہ یوں زمانے میں
یہاں سے آب بقائے دوام لے ساقی

(مہندر سنگھ بیدی سحر)

طور تھا کعبہ تھا دل تھا جلوہ زاریار تھا
عشق سب کچھ تھا مگر پھر عالم اسرار تھا

(فراق)

کیا ہوگا کبھی آدم کو سجدہ کہنے سننے سے
فرشتے اب کہاں پرواے آدم زاد کرتے ہیں

(سرسوتی سرن کیف)

اس طرح دیکھا جائے تو سینکڑوں ایسے اشعار ہیں جس میں صاف گوئی، سچائی، وضع داری، تہذیب وتمدن اور اسلامی بات کے ساتھ ساتھ حشر کے رحمتوں کا سائباں، سجدے کی تڑپ، مہر ووفا، جزا اور سزا، عرفان وآگہی، تصوف ومعرفت، روحانیت، رموز واسرار، لوح وقلم غرض وہ سبھی کچھ جو اسلامی تعلیمات کا حصہ ہیں ان کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

اس لئے بلا تامل یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اردو شاعری میں غیر مسلم شعرا کا اسلامی نظریہ بڑی خوبی کے ساتھ جلوہ گر ہے جس کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

❑❑❑

'نیا دور' کو ایسی ادبی تخلیقات کا شدت سے انتظار ہے جو نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی بھی ہوں۔ ایسی تخلیقات جو اعلیٰ درجے کے ادبی شہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں مگر عام قاری کی دلچسپی سے عاری ہوں تو اسے 'نیا دور' اپنی اشاعتی ترجیحات میں شامل کرنے سے گریز کرے گا کیونکہ معاملہ دراصل اردو کے فروغ کا ہے۔ اردو محض یونیورسٹیوں کے شعبوں، تحقیقی اداروں اور دیگر اردو مراکز تک اپنی مخصوص ضرورتوں کے تحت محدود رہے، اس روش سے بہر حال پرہیز کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ہم سب کا اولین فریضہ ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں پوری تندہی کے ساتھ شامل رہیں اور عام قاری سے اردو کے مراسم کو استوار کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ تخلیق کا غیر مطبوعہ ہونا لازمی شرط ہے۔ تخلیق کے ساتھ اپنی تصویر، ٹکٹ لگا ہوا لفافہ معہ پتہ اور بینک اکاؤنٹ نمبر، آئی۔ایف۔ایس۔سی۔، برانچ کوڈ والا Cancelled Cheque بھی ضرور ارسال کریں۔ **مصنف کے بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات کے بغیر حاصل ہونے والی تخلیقات کسی بھی صورت میں شائع نہیں کی جائیں گی کیونکہ اس کے سبب ہی دیگر تخلیق کاروں کے اعزازیہ میں غیر ضروری تاخیر ہوتی ہے۔ بغیر بینک تفصیلات کے تخلیقات ارسال کرنے والے اعزازیہ کے حقدار نہیں ہوں گے۔**

اردو شعر و ادب کے فروغ میں لکھنؤ کے غیر مسلم شعراء کا کردار

اسرارالحق
۱۱۷ / ۱۶۳، چکمنڈی، مولوی گنج، لکھنؤ
موبائل: 7510059135

اردو زبان زندہ قوموں کے لئے ہے۔ ہندوؤں کے پڑھے لکھے طبقے نے اسے اپنا کر فیض اٹھایا ہے۔ اسی میں اردو کا فروغ ہوا ہے۔ شاہان تغلق کے دور حکومت میں پنڈت بھی فارسی پڑھتے تھے۔ علمی مباحث، قوموں اور زبانوں کے اختلاط و امتزاج کو پوری صدی نہیں گزری تھی کہ لودیوں کا بازار چمکا۔ بہلول لودی کے بعد سکندر لودی کو ہندوستان کی ادبی تاریخ میں زبردست نمائندگی حاصل ہے۔ وہ خود بھی شاعر تھا۔ گلرخ تخلص تھا اور اس مخلوط زبان کا شیدائی تھا۔ فارسی میں ایک طب سکندری اس کی یادگار ہے۔ سکندر کے دربار سے ہندو شاعر بودھن وابستہ تھا۔ جس کی فضیلت ناقابل انکار ہے۔ سکندر نے اردو زبان کے سیکھے کی سرکاری طور پر تحریک چلائی۔ کائستھ طبقہ نے سکندر کی آواز پر لبیک کہہ کر سرکاری زبان کی تحصیل شروع کی۔ ان لوگوں نے قلیل مدت میں اس زبان میں کامل دستگاہ پیدا کر لی اور اس سلطنت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو گئے۔ راجاؤں کی منشی گیری انہیں کے سپرد تھی۔ پنواری انہیں لوگوں میں سے ہوتے تھے۔ شیر شاہ کے زمانے میں ان لوگوں نے بہت ترقی کی۔

چنانچہ اکبر کے زمانے میں جب راجہ ٹوڈرمل نے فارسی کو سرکاری زبان قرار دیا تو معاملات سلطنت میں اس سریع اقدام سے ابتری نہ پھیلنے کی وجہ بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک جماعت فارسی و اردو کی پہلے سے موجود تھی۔ جس نے فی الفور نئے نظام پر عمل درآمد شروع کیا۔ یہ جماعت کائستھوں کی تھی۔ اس زمانے سے آج تک کائستھوں نے جس قابلیت اور حسن فہم کا ثبوت دیا ہے اس کے اثبات کے لئے بے شمار تصانیف موجود ہیں۔ درگا پرشاد نے تذکرۃ النساء میں لکھا ہے کہ مردوں کے علاوہ کائستھ عورتیں بھی فارسی و اردو جانتی تھیں۔ عہد محمد شاہی میں کائستھ سرکاری دفاتر پر چھا گئے۔ مرہٹوں کی حکومت میں بھی منشیانہ کاروبار یہی لوگ انجام دیتے تھے۔ جب انگریزوں نے حکمرانی کی باگڈور اپنے ہاتھ میں لی تو اکثر اکابر اسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور آج بھی یہ قوم اپنی ذہانت کے لئے مشہور ہے۔

کائستھ کے بعد سب سے زیادہ کشمیری پنڈتوں کو فارسی و اردو سے شغف رہا ہے۔ یہی دو طبقہ ہیں جنہوں نے فارسی و اردو کی خدمات میں نمایاں طور پر حصہ لیا۔ ان کے علاوہ کھتری خاندان کے لوگ بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ جنہوں نے اس زبان کی آبیاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔

دکن میں جس طرح علم وفن کی ترقی ہوئی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں غیر مسلم ادباء و شعراء شامل رہے۔ قطب شاہی دور کا ہندو شاعر کیشو سوامی کیشو (۱۶۸۲ء-۱۶۲۱ء) سلطان ابوالحسن تانا شاہ کے عہد میں معزز عہدے پر مامور تھا۔ کیشو کے استاد دکن کے مشہور فلسفی شاعر رام داس تھے۔ کیشو کا شاہکار 'اکادشی چرتر' اور مراٹھی میں 'الہنگ بھجن' وغیرہ مشہور ہیں۔ اس کے لاتعداد شاگرد تھے۔

مغلوں کی فتح کے بعد دکن کی ساری سلطنتوں کے حدود مٹ کر ایک ہو گئے اور معاشرتی تہذیبی اور لسانی سطح پر ایک کھچڑی سی پکنے لگی۔ حسین ذوقی اور بحری نے اپنی آنکھوں سے دکنی کو ریختہ بنتے دیکھا ہے۔

ولی محمد ولؔی کو اردو شاعری کا بابا آدم کہا جاتا ہے۔ شمالی ہند میں ولؔی کے بعد ہی اردو شاعری کا رواج عام ہوا۔ اب مثنوی کی جگہ غزل نے لے لی۔ لوگوں نے فارسی ترک کر کے اردو میں باقاعدہ طبع آزمائی شروع کر دی۔ اس دور میں سراج الدین سراؔج (۱۱۷۷ھ مطابق ۱۷۶۳ء-۱۱۲۷ھ مطابق ۱۷۱۴ء) پر گو شاعر تھے۔ کلیات کے علاوہ مثنوی بوستان خیال ان کی یادگار ہے۔

لالہ موہن لال مہتاؔب (متوفی ۱۲۰۰ھ مطابق ۱۷۸۵ء) باکمال شاعر تھے۔ لچھمی نرائن شفیق (۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۸ء-۱۱۵۷ھ مطابق ۱۷۴۵ء) نے 'چمنستان شعراء' تذکرہ لکھا۔ لالہ جے کشن بیجان سراج الدین سراج کے اور بالاجی ترمیک ذرؔہ مرزا جان رسؔا کے شاگرد تھے۔ لالہ ہیم چند نے شاہنامہ کا ترجمہ ۱۲۰۷ھ مطابق ۱۷۹۲ء میں کیا۔ مہاراجہ چندولال شاداں (۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء -۱۱۸۹ھ مطابق ۱۷۸۳ء) ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔ شاداؔں مسند وزارت پر بھی سرفراز تھے۔ ان کے دربار میں اردو اور فارسی کے شعراء جمع رہتے تھے۔ محفل شعرو سخن آراستہ رہتی تھی۔ بالا پرشاد ربؔط حیدرآباد میں پیدا

ہوئے لیکن ان کے آبا و اجداد لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ آپ کی غزلیں محفلوں میں گائی جاتی تھیں۔ راجہ مکھن لال مکھن نے ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۴ء میں عمر خیام کی رباعیات کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ مکھن کے دیوان میں غزلیات، ترجیع بند اور مخمس ہیں۔ ان میں شیخ عبد القادر جیلانی اور پنجتن پاک کی مدح ہے۔

سلطنت آصفیہ میں فارسی کے بجائے اردو دفاتر کی زبان قرار دی گئی۔ شعراء کی سرپرستی، تصنیف و تالیف کا دور، اخبارات و رسائل کا اجراء، علمی و ادبی انجمنوں کے قیام سے اردو کی غیر معمولی ترقی ہوئی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے یہاں کئی سال تک رسالہ دبدبۂ آصفی کی ادارت کی۔ حیدر طباطبائی نظمؔ (۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۳ء) لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ فارسی کے جید عالم منشی مینڈو لال زارؔ لکھنوی سے نظمؔ نے فارسی پڑھی۔ ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء کے بعد کے ہندو شاعروں میں گردھاری لال پرساد باقی فیضؔ کے شاگرد تھے۔ اردو دیوان 'بقائے باقی' کے علاوہ متعدد تصانیف ہیں۔ ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۶ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ شیتل پرشاد خرمؔ (۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۲ء-۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۲۲) اور بہاری لال رمزؔ بھی فیضؔ کے شاگرد تھے۔ رمزؔ کا انتقال دوران مشاعرہ ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء میں ہوا۔ گورسرن بیلی آزادؔ قوم کائستھ ایک مشہور خاندان کے فرد تھے۔ آپ کے دادا توکلؔ والد اوجؔ اور چچا انورؔ تخلص کرتے تھے۔ آزادؔ کو ضامن کنتوی سے تلمذ تھا۔ آپ کا زیادہ تر کلام تصوف میں ہے۔ راجہ کشن پرشاد شادؔ نے صوفیانہ نقطۂ نظر سے منفرد نظمیں کہیں۔ راجہ راجیشور راؤ بہادر اس عہد کے پرگو شاعر اور مصنف تھے۔ اصغرؔ تخلص تھا۔ فن نعت سے آپ کو بڑی دلچسپی تھی۔ اس کے علاوہ شائع شدہ نعتوں کے بلحاظ حروف تہجی، عربی، فارسی اور اردو کی ۲۶ رجلدیں مکمل کی ہیں۔ مانک راؤ، وٹھل راؤ کی کتاب 'بستان آصفی' کی سات جلدیں شائع ہوئی ہیں۔ سلطنت آصفیہ کے متعلق عام تاریخی حالات و واقعات جس قدر تفصیل سے اس کتاب میں درج ہیں وہ کسی اور کتاب میں نہیں ملتے۔ ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۴ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ اس طرح اگر ہم حیدرآباد کے ہندو باکمال شعراء کا مطالعہ کریں تو ان کی تعداد کم نہ ہوگی۔

اس دور (۱۳۷۴ھ مطابق ۱۹۵۴ء-۱۳۳۶ء مطابق ۱۹۱۷ء) میں جامعہ عثمانیہ کے قیام سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس دور کے ہندو شعراء میں گوندر راؤ جذب، بشن سنگھ خوشترؔ، گووند راؤ دردؔ وغیرہ ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کی پیداوار ہندو شعراء میں مہندر راج سکسینہ، رگھونندل راج سکسینہ، شنکر مدھو لال ارمانؔ ہیں۔ راجہ نرسنگھ راج عالیؔ (۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۶ء) حیدرآباد میں پیدا ہوئے اور (۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء) میں انتقال ہوا۔ جلیلؔ کے شاگرد تھے۔ عالیؔ کا کلام تصوف و معرفت میں ڈوبا ہوا ہے۔ حکیم ست گرو پرشاد رہبرؔ قوم کائستھ زیرک کے شاگرد تھے۔ مختصر یہ کہ جامعہ عثمانیہ کی وجہ سے حیدرآباد پر جو علمی فضا چھائی ہوئی تھی وہ ادب اردو کے لئے نہایت روشن مستقبل کی ضامن تھی۔ اس زمانے میں مذہبی تحریک کا خاص ذریعہ شاعری تھی۔

بھکتی تحریک کے سب سے بڑے شاعر کبیرؔ تھے۔ یہ بنارس کے رہنے والے ذات کے جلاہے تھے۔ توحید ان کا شیوہ اور بت پرستی و شرک کی مخالفت ان کا ایمان تھا۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ عشق ہی عرفان ذات کا ذریعہ ہے۔ اسی سے آتما کو شانتی ملتی ہے۔ رام اور رحیم ایک ہیں۔ یہی اللہ ہے جو ہمہ صفات ہے جس کی کوئی شکل نہیں، جو ہر جگہ موجود ہے۔ انسان کا دل خدا کا گھر ہے۔ عشق کے ذریعہ خدا تک پہنچا جا سکتا ہے۔ دنیا مایا جال اور خدا منزل ہے۔ جسے خدا مل گیا اسے سب کچھ مل گیا۔ بے ثباتی دہر ان کا محبوب موضوع ہے۔ دل کی صفائی اور من کا پریم ہی اصل چیز ہے۔ اگر انسان کے اندر یہ نہیں پھر وہ انسان نہیں رہتا۔ انہیں خیالات کو کبیرؔ نے بڑے دلآویز انداز میں پیش کیا ہے۔ بیجک اور بانی ان کے کلام کے مجموعے ہیں جن سے ذیل میں چند دوہے نقل کئے جاتے ہیں:

نہائے دھوئے کیا بھیا جو من کا میل نہ جائے
میل سدا جل میں رہے دھوئے باس نہ جائے

ست نام کڑوا لگے میٹھا لاگے دام
دبدھا میں دونوں گئے مایا ملی نہ رام

ماٹی کہے کمہار سے تو کیا روندے موہ
اک دن ایسا ہوئے گا میں روندوں گی توہ

نور الدین جہانگیرؔ (۱۶۲۷ء-۱۶۰۵) ایک ہندو رانی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ 'تزک جہانگیری' میں جس طرح جہانگیر نے اردو زبان استعمال کی ہے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ زبان جہانگیر کے مزاج میں رچی بسی تھی جس زبان کو جہانگیر نے ہندی کہا ہے۔ یہ وہی زبان ہے جسے آج ہم اردو کہتے ہیں۔ شاہجہاں (۱۰۶۸ء مطابق ۱۶۲۷ء-۱۰۳۷ھ مطابق ۱۶۵۷ء) کے زمانے میں اس زبان کے رواج کی جڑیں معاشرے میں اتنی پیوست ہوجاتی ہیں کہ شاہی ملازمتوں کے لئے اس زبان سے واقف ہونا ضروری تھا۔ شاہجہاں خود اس زبان میں گفتگو اور خط و کتابت کرتا تھا۔ اس دور میں اردو زبان کی ایک معیاری شکل بن گئی۔ پنڈت چندر بھان برہمنؔ (۱۰۷۳ھ مطابق ۱۶۶۲ء-۹۷۲ھ مطابق ۱۵۷۴ء) اردو اور فارسی میں شعر کہتا تھا۔ قوت اظہار نے اپنے ارتقاء کی منزلیں طے کر لی تھیں۔ برہمنؔ کی غزل دیکھئے جو ولی دکنی کی شاعری سے بہت پہلے کی ہے۔

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے، نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے

پیا کے ناؤں کی سمرن کیا چاہوں کروں کس سے
نہ تسبیح ہے نہ سمرن ہے نہ گنٹھی ہے نہ مالا ہے

خوباں کے باغ میں رونق ہوئے تو کس طرح یاراں
نہ دونا ہے نہ مروا ہے نہ سوسن ہے نہ لالا ہے

برہمنؔ واسطے اسنان کے پھرتا ہے بگیا میں
نہ گنگا ہے، نہ جمنا ہے، نہ ندی ہے نہ نالا ہے

سیناپتی سردمن مسرا، بنارسی داس بھوشن متی، رام دیو اور کیشر داس وغیرہ ہندی کے باکمال شعراء اسی عہد میں ہوئے ہیں۔ منشی ولی رام ولیؔ کائستھ سکسینہ شاہجہاں آباد کے رہنے والے شاہزادہ داراشکوہ کے مشیر خاص تھے۔ ولیؔ کے ہم عصر شعراء میں جسونت رائے منشی سعادت اللہ خاں کے درباری شاعر تھے۔ منشی کو نظم ونثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ ان کی ایک تالیف 'گلشن سعادت' ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر (۱۷۰۷ء مطابق ۱۱۱۹ھ-۱۶۵۸ھ مطابق ۱۰۶۹ء) کے ابتدائی عہد حکومت اور آخری دور میں زبان کے رواج اور استعمال میں غیر معمولی فرق نظر آتا ہے۔ اورنگ زیب کے آخری زمانے کا ایک شاعر بھبھوتی لال تھا۔ یہ قوم کا بھاٹ تھا اور موضع عطائی پور ضلع فرخ آباد کا رہنے والا تھا۔ اس نے جشن فتحیابی کے موقع پر ایک قصیدہ اردو زبان میں لکھ کر نواب کی خدمت میں پیش کیا جس کے صلہ میں اسے ایک موضع عطا کیا گیا۔

آرزوؔ نے یہاں کے شعراء کو بجائے فارسی کے اردو زبان میں شاعری کرنے کی ترغیب دی۔ لالہ ٹیک چند بہارؔ، یک رنگ، بے نوا، آنند رام مخلصؔ وغیرہ ان کے شاگرد و تربیت یافتہ تھے۔ اس دور میں آرزو نے ادبی رہنمائی کا کام اس طرح انجام دیا کہ نوجوانوں میں ریختہ کا ذوق پیدا کرنے کی غرض سے ہر مہینے کی پندرہ تاریخ کو اپنے گھر پر محفل مراختہ کا اہتمام کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئی نسل نے فارسی ترک کر کے پوری توجہ ریختہ پر صرف کی۔

رائے آنند رام مخلصؔ (۱۱۶۴ھ مطابق ۱۷۵۰ء -۱۱۱۱ھ مطابق ۱۶۹۹ء) بنیادی طور پر فارسی کے شاعر اور انشاپرداز تھے۔ تین پشتوں سے فارسی زبان اس خاندان کی روزی کا وسیلہ اور عزت کا ذریعہ تھی۔ مخلصؔ (۱۱۳۲ھ-۱۷۱۹ء) کو رائے رایاں کا خطاب ملا۔ پہلے بیدلؔ سے پھر آرزوؔ سے مشق سخن کی۔ مخلصؔ کی تصانیف، کارنامۂ عشق، رقعات، ہنگامۂ عشق، مراۃ اصطلاح چمنستان دیوان فارسی، سفرنامہ، پری خانہ (خطاطی و مصوری کا مرقع) وغیرہ ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ میں مخلصؔ کی اہمیت اس لئے ہے کہ وہ فارسی کے شاعر اور انشاپرداز ہونے کے باوجود اس دور کے ریختہ گویوں میں سے تھے۔ مولانا امتیاز علی عرشی نے کلیات نظم فارسی سے مخلصؔ کا اردو کلام مرتب کیا ہے۔ مخلصؔ کے رنگ سخن کو دیکھنے کے لئے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

کریں گے فصل گل غم آشنا ہے باغباں اپنا
قدیمی صاحب اپنا، مشفق اپنا، مہرباں اپنا
خدا سے ٹک تو ڈر شیریں خبر لے اس بیچارے کی
کیا فرہاد نے تیشے سے سر لہولہاں اپنا
غزالاں بیچ چرچا ہے ترے مژگاں و ابرو کا
مے بھی تک دکھایا اے میاں ترکش کماں اپنا
جنوں پیدا کر اے دل، عقل اگر ہے
بہار آئی دیوا نے، کچھ خبر ہے؟

لالہ ٹیک چند بہارؔ دہلوی: (۱۱۸۰ھ مطابق ۱۷۶۶ء -۱۰۹۹ھ مطابق ۱۶۸۷ء) بنیادی طور پر فارسی کے شاعر اور آرزوؔ کے شاگرد تھے۔ ان کی مشہور زمانہ لغت 'بہار عجم' فارسی زبان کی اہم لغت ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ ان کی ایک اور تصنیف 'جواہر الترکیب' کا ذکر کیا ہے۔ بہارؔ مخلصؔ کے مقابلے میں زبان و بیان پر زیادہ قدرت رکھتے ہیں: چند شعر دیکھئے:

دل ہمارا لے کے کیوں انکار کرتے ہوئے سجن
کس سے یہ سیکھے ہو تم لے کر مکر جانے کی طرح

وہی اک ریسماں ہے جس کو ہم تم تار کہتے ہیں
کہیں تسبیح کا رشتہ کہیں زنار کہتے ہیں
گیا ہے عشق کی رہ بیچ پا برہنہ بہارؔ
تمام دشت ہے پرخار دیکھئے کیا ہو

آفتاب رائے رسواؔ دہلوی (وفات ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۷ء) مہاراجہ رام نرائن موزوں عظیم آبادی (وفات ۱۱۷۷ھ مطابق ۱۷۶۳ء) سیتا رام عمدہؔ وغیرہ اس دور کے ہندو شاعر ہیں۔ اٹھارہویں صدی تاج محل والی تہذیب کے زوال کی صدی تھی۔ یہ دور میرؔ و سوداؔ کا دور کہلاتا ہے۔ اس دور کے ہندو شعراء میں لالہ بندرابن راقمؔ دہلوی، لالہ بال مکند رحضورؔ دہلوی، راجہ نول رائے وفاؔ (قنوج)، مکند لال فدوی لاہوری، لالہ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے خاص شہرت حاصل کی۔ لکھنؤ میں رائے سرب سکھ دیوانہ، رائے منو لال صفا، صاحب رائے صاحبؔ وغیرہ ہندو شعراء تھے۔ دہلی کے جن شعراء نے لکھنؤ کی تہذیب کی ترجمانی کے لئے اردو شاعری کو نیا طرز دے کر لکھنؤ کے شعراء کو راستہ دکھایا ان میں میر سوزؔ کے علاوہ جعفر علی حسرتؔ کا نام بھی خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ حسرتؔ کے لاتعداد شاگرد تھے اور حسرت خود رائے سرب سکھ دیوانہؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ لکھنوی شاعری کو نیا طرز دینے میں ہندو شاعر رائے سرب سکھ دیوانہؔ کو اولیت حاصل تھی۔ رائے سرب سکھ دیوانہؔ سے لکھنؤ کے ہندو شعراء کا آغاز ہوتا ہے۔ ان کے شاگرد راجہ جسونت سنگھ پروانہؔ کائستھ اور نواب شجاع الدولہ کے دیوان تھے۔ مصحفیؔ کے شاگرد تھے۔ شیخ امام بخش ناسخؔ نے اپنے دیوان جلد دوم صفحہ ۲۱۸ پر پروانہؔ کا یہ قطعہ تاریخ کہا ہے:

ازم مردنِ پروانہ جان سوختہ
شمع بزم اھل سخن ھائے بمرد
تاریخ رقم نمودم ناسخ
پروانہ بمرد شمع ھم وائے بمرد

متذکرہ بالا تاریخ وفات سے ۱۲۲۸ھ مطابق ۱۸۱۱ء برآمد ہوتا ہے۔ پروانہؔ کا قلمی نسخہ دیوان کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں محفوظ ہے۔ پروانہؔ کا ضرب المثل شعر یہ ہے:

جس نے دیکھا، اسے کیا سجدہ
غرض اس بت نے بھی خدائی کی

مصحفیؔ کو جگت استاد تسلیم کیا جاتا ہے۔ لکھنؤ میں بہت سے ہندو شعراء نے مصحفیؔ کے آگے زانوئے ادب

تہہ کیا۔ ان میں لالہ کانجی مل صباؔ بھی ہیں۔ صباؔ کا نمونۂ کلام دیکھئے:

مجلس سے اٹھ کے جب وہ رشک قمر گیا ہے
اپنا تو روتے روتے نور نظر گیا ہے
بھٹکا پھرے ہے مجنوں لیلیٰ کے قافلہ میں
یہ پوچھتا کہ یادو محمل کدھر گیا ہے
کیا تو نے کچھ صباؔ سے اے تندخو کہا تھا
روتا ہوا ادھر سے باچشم تر گیا ہے

اسی طرح موجی رام موجیؔ کے متعلق مصحفیؔ نے کہا تھا کہ یہ درجۂ استادی تک پہنچے۔ موجیؔ کا یہ قطع ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے:

وصل بھی دیکھا جدائی دیکھ لی
حق نے جو صورت دکھائی دیکھ لی
دل کے آئینہ میں ہے تصویر یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

موجیؔ کے بعد ایک بڑا نام لکھنؤ کے ہندو شعراء میں آتا ہے۔ آپ کا نام چھنو لال دلگیرؔ ہے۔ دلگیرؔ میر انیسؔ سے قبل لکھنؤ کے مرثیہ گو ہوئے ہیں۔ غزل میں طرب تخلص تھا۔ مرثیہ میں دلگیر تخلص تھا۔ میر خلیقؔ اور فصیحؔ ان کے ہم عصر تھے۔ ابتدا میں مرزا خانی نوازش سے اصلاح لی پھر انہیں کے مشورہ سے ناسخؔ کے شاگرد ہوئے۔ دلگیرؔ کے دیوان لکھنؤ یونیورسٹی میں ٹیگور لائبریری میں ہیں۔ ان کا انتقال ۱۲۲۴ھ کو ہوا۔ ان کے بعد راجہ الفت رائے الفت مرزا دبیرؔ کے شاگرد تھے۔ مرثیہ گو اور مرثیہ خواں تھے۔ شاہی زمانہ میں فوج کے بخشی تھے۔ کلیات مراثی، سلام، دیوان غزلیات ان کی یادگار ہیں۔ ان کا ایک مرثیہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ رائے ٹیکا رام تسلیؔ کے والی کو آصف الدولہ کے عہد میں بخشی گری کا محکمہ سپرد ہوا تھا۔ تسلی ذی استعداد اور صاحب تصانیف تھے۔ مجموعۃ الشعراء ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ ۱۲۲۹ھ میں تسلی کو اس کتاب کی تالیف سے فرصت ملی۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ مرزا فاخر مکیںؔ اور مصحفیؔ کے شاگرد تھے۔ تسلیؔ نے ایک دیوان فارسی اور ایک اردو میں مرتب کیا تھا۔ جگن ناتھ سہائے خوشترؔ واجد علی شاہ کی سرکار میں متصدی تھے۔ خوشترؔ نے رامائن کا منظوم ترجمہ اردو میں کیا۔ خوشترؔ نے ۱۸۵۱ء میں ۴۳ سال کی عمر میں تلسی کرن رامائن کا حرف بہ حرف ترجمہ دلکش انداز میں کیا۔ رامائن خوشترؔ پہلی مرتبہ ۱۸۶۴ء میں مطبع نول کشور سے شائع ہوئی۔ مینڈولال زارؔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں حیات تھے۔ ۱۸۵۸ء میں انتقال ہوا۔ آپ کی تصنیف گلزار فصاحت درسیات میں اعلیٰ درجہ کی تصنیف ہے۔ زارؔ کے دو شعر ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں:

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرت انسان پر
فعل بد تو خود کریں لعنت کریں شیطان پر

اسی طرح کنور سین کرپا دیال مضطرؔ لکھنوی مصحفیؔ کے شاگرد تھے۔ راجہ جیالال گلشنؔ خواجہ حیدر علی آتشؔ کے شاگرد تھے۔ ان کے بعد ایک بڑا نام پنڈت دیا شنکر نسیمؔ کا ہے۔ ان کی شہرت گلزار نسیم مثنوی سے ہوئی۔ یہ بھی آتشؔ کے شاگرد تھے۔ رائے جوہر سنگھ جواہرؔ سلطنت انگلیشیہ میں چیف کمشنر کے دفتر میں منصرم کاغذات شاہی مقرر ہوئے۔ پھر ملیح آباد میں تحصیلدار ہوئے۔

جوہر کی وفات ۱۸۸۰ء میں ہوئی۔ منشی خیالی رام خیالیؔ لکھنوی ایسے شاعر ہوئے کہ انہوں نے تقریباً سو کتابیں لکھیں۔ ایک نسخہ ندوہ لائبریری میں موجود ہے۔ دیوان دیا کرشن ریحانؔ آخری فرمانروائے اودھ واجد علی شاہ کے بخشی الملک راجہ الفت رائے کے یہاں دیوان توشک خانہ تھے۔ ان کا دیوان باغ ریحان لکھنؤ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ موجی رام موجیؔ کے شاگرد تھے۔ طوطا رام شایاں اور خیراتی لال شگفتہ بھی بڑے شاعر تھے۔ شنکر دیال فرحت نے رامان فرحت لکھی۔ منشی شیو پرساد وہبیؔ مطبع نول کشور اودھ اخبار کے منیجر تھے۔ قلقؔ کے شاگرد تھے۔ غزلوں کے علاوہ عمدہ نعتیں کہیں۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کی اردو میں حیثیت سبھی کو معلوم ہے۔ لکھنؤ کے محلہ نوبستہ میں پنڈت دوارکا پرساد افقؔ کا خاندان شاعر تھا۔ اس میں رام سہائے تمنا، ماتا پرساد دینساں اور ان کی اہلیہ کشن پیاری تک شاعرہ تھیں۔ تمناؔ نے منظوم اخبار تمنائی نکالا تھا۔ اسی عہد میں لچھمن پرساد صدرؔ اور نوبت رائے نظرؔ بڑے شاعر ہوئے۔ پنڈت برج نارائن چکبست کی اردو ادب میں خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ان کا یہ شعر مشہور ہے:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا

بشیشور پرساد منورؔ افقؔ کے بیٹے تھے۔ ڈاکٹر شباب للت، شملہ نے ان پر تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ وشنو کمار شوقؔ لکھنوی غزل کے اچھے شاعر تھے۔ ان کی غزلیں قابل مطالعہ ہیں۔ مذکورہ بالا شعراء لکھنؤ کے ہندو شعراء ہیں جنہوں نے اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت میں حصہ لیا۔ اسی طرح صرف اودھ پھر یوپی، اس کے بعد مختلف ریاستوں کے ہندو شعراء کا تذکرہ ہو تب بات واضح ہوگی کہ آخر کتنی تعداد ہے ان ہندو شعراء کی جنہوں نے اردو کو اپنایا اور اس میں اپنی صلاحیتوں کے موتی پروئے۔ اردو کے نامور شعراء میں تلوک چند محرومؔ، رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری، درگا سہائے سرورؔ جہان آبادی، جگن ناتھ آزاد شملہ، چندر بھان خیالؔ وغیرہ ہیں۔

ہمیں اردو زبان وادب کی خدمت میں ہندوؤں کی خدمات کو از سر نو تحقیق کے ذریعہ سامنے لانا ہوگا اور اپنی کدوکاوش سے ان کے گمشدہ پہلوؤں کو سامنے لانے کی سعیٔ جمیلہ کرنی ہوگی۔ تب وہ تحریر بھی دل پذیر ہوگی اور وہ دستاویز بھی ہمارا سرمایۂ افتخار بنے گا۔

□□□

فارسی تاریخ نویسی میں غیر مسلم مصنفین کا حصہ

سعدیہ جعفری
شعبۂ اردو و فارسی، الٰہ آباد یونیورسٹی، الٰہ آباد
موبائل: 9450703849

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ایک نئی تہذیب، ثقافت اور تمدن کا آغاز ہوا۔ اس سلسلے میں تغلق خاندان کے بادشاہوں نے اہم رول ادا کیا۔ کچھ مورخین کا کہنا ہے کہ اشوک کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ پورا ہندوستان ایک سیاسی اور تہذیبی شکل میں اُبھرا۔ سلطان غیاث الدین تغلق نے علوم وفنون اور تاریخ نویسی کی طرف خصوصی توجہ دی جس کی بنا پر آگے بے شمار ادباء وشعراء اور مورخین نے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ مغلوں کی آمد کے بعد یہ سلسلہ اور بھی مستحکم ہو گیا۔ اس دور میں نہ صرف مسلمان ادباء، شعراء اور مورخین پیدا ہوئے، بلکہ ہندوں کی ایک بڑی تعداد نے فارسی تاریخ نویسی میں حصہ لیا۔ اس مقالہ میں مختصراً مشہور مورخین کا تعارف پیش کرتی ہوں۔

(۱) لالہ بھگوان داس:

عہد شاہجہانی میں جن ہندو مورخین نے شہرت حاصل کی ان میں لالہ بھگوان داس یا بھگونت داس کا نام سرفہرست ہے۔ ان کی تصنیف شاہ جہاں نامہ یا نسبت نامہ صاحقران کے نام سے مشہور ہے۔ اس کتاب میں آدم علیہ سلام سے لے کر شاہ جہاں کے زمانے تک کی تاریخ نہایت مختصر طور پر موجود ہے۔ شاہ جہاں کے عہد میں رونما ہونے والے واقعات کے وہ چشم دید گواہ تھے۔ اس کتاب کی زبان نہایت آسان اور سلیس ہے۔(۱)

(۲) منشی چندر بھان برھمن:

ان کا شمار بھی عہد شاہجہانی کے زبردست شعراء، ادباء اور مورخین میں ہوتا ہے۔ ان کی تصنیف منشات برھمن، تحفۃ الانوار، چہار چمن اور تذکرہ برہمن وغیرہ ہیں۔

(۳) سجان رائے بھنڈاری:

عہد عالمگیری کا زبردست ھندو مورخ ہے جسکی کتاب خلاصہ التواریخ ہندوستان کی ایک اہم اور مستند تاریخ سمجھی جاتی ہے۔ تاریخ کی یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔

(۴) بھیم سین بُرہانپوری:

اس کی کتاب نسخہ دُلکشا ہے۔ جس میں عہد عالمگیری کی مفصل تاریخ ملتی ہے اور دکن کے واقعات ترتیب سے بیان کئے گئے ہیں۔

(۵) پنڈت ایشور داس:

عہد بابر سے لے کر اورنگ زیب تک مشہور ھندو مورخین میں ایشور داس کا شمار ہوتا ہے انکی کتاب فتوحات عالمگیری آفاقی شہرت کی حامل ہے۔ فتوحات عالمگیری سات (۷) ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب کچھ خامیوں کے باوجود ادبی اور تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ کتاب عہد عالمگیری کا ایک آئینہ ہے۔

(۶) لالہ کیول رام:

مورخوں کی فہرست میں لالہ کیول رام کا نام معتبر ہے۔ ان کی شہرت ان کی تصنیف تذکرۃ الامراء سے ہے۔ جسے انہوں نے روزنامچوں اور وقائع ناموں کی مدد سے تیار کیا ہے۔ یہ کتاب عہد اکبری سے بہادر شاہ کے زمانے تک کے ہندو اور مسلمان امراء اور درباریوں کا تذکرہ ہے۔

(۷) بندرابن داس:

بندرابن داس کا شمار عہد عالمگیری کے مورخوں میں ہوتا ہے۔ ان کی تصنیف خلاصۃ التواریخ ہے۔ جس کا دوسرا نام لب التواریخ ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے آریوں کے عہد سے لے کر عہد عالمگیری تک کی تاریخ کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب ایک دیباچہ دس حصّوں اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب غوری سے لے کر اورنگ زیب تک کی عام تاریخ ہے۔

(۸) خوشحال چند کائستھ:

خوشحال چند کائستھ کا شمار عہد عالمگیری کے مورخین میں ہوتا ہے۔ ان کا پورا خاندان مغلوں کا نمک خوار تھا۔ ان کی تصنیف تاریخ محمد شاہی ہے جو تاریخ نادر الزمانی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب محمد شاہ کے دور کی ایک اہم اور مستند تاریخ ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں آفرینش سے لے کر محمد شاہ کے زمانے تک دانشوروں مذہبی رہنماؤں اور ہندوستان میں ابراہیم لودی کی مختصر تاریخ کا ذکر ہے۔ اس کتاب کے آخر میں ۲۵۸ شعراء کا مختصر تذکرہ بھی ہے۔

(۹) شیوداس لکھنوی:

شیوداس لکھنوی کا شمار فرخ سیر اور محمد شاہ کے مشہور ترین مورخوں میں ہوتا ہے۔ ان کی مشہور تصنیف ''شاہ منور کلام'' ہے۔ اس تصنیف کا دوسرا نام ''تاریخ منور کلام'' بھی ہے۔ یہ کتاب اس زمانے کی تاریخ ہے جب مغل سلطنت کا چراغ بجھ رہا تھا اور ہندوستان کے ایک بڑے حصّے پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ یہ کتاب ۱۲۴ واقعات، ۲۰ سرکاری خطوط اور ۲۲ شاہی فرمان پر مشتمل ہے۔

(۱۰) لالہ چترمن:

فارسی زبان وادب کی بیش بہا خدمات انجام

دینے میں جن مشہور ہندو مورخوں نے حصّہ لیا ان میں سے ایک لالہ چترمن بھی مشہور مورخ ہیں۔ان کی شہرت کا دارومداران کی ایک تاریخی کتاب ''چہار گلشن'' ہے۔جو ''چترگلشن'' اخبارالنوادر اور ''خلاصۃ النوادر'' کے نام سے بھی مشہور ومعروف ہے۔ چارابواب میں منقسم یہ کتاب انھوں نے غازی الدین حیدر کی فرمائش پر لکھی تھی۔اس کتاب میں احمد شاہ درانی کے بعد کی تاریخ کا ذکر ہے۔ جو ۱۱۷۳ھ میں ہونے والے واقعات پر مشتمل ہے۔

(۱۱)لالہ ھرچرن داس:

لالہ ھرچرن داس کا شمار بھی فارسی زبان وادب کے ھندو مورخین میں ہوتا ہے۔ ان کی معرا کتہ الآرا تصنیف چہار گلزار شجاعی ہے۔ یہ کتاب تاریخ کی اہم اور مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔

(۱۲) جگجیون رام داس:

فارسی زبان و ادب کے ھندو مورخین میں جگجیون رام داس کا شمار ہوتا ہے عہد عالمگیری کے مورخوں میں جگجیون رام داس کو خاص مقام و مرتبہ حاصل تھا۔ ان کی شہرت کا دارومدار ان کی تصنیف ''معرکتہ الآرا'' منتخب التواریخ پر ہے اس کتاب کو لکھنے کا کام انھوں نے اورنگ زیب کے زمانے سے ہی شروع کر دیا تھا اور بہادر شاہ اول کے عہد میں اس کتاب کو اختتام تک پہنچایا۔تاریخی اعتبار سے یہ کتاب ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

(۱۳)منشی منالال:

منشی منالال نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز روزنامہ نویسی سے کیا۔ وہ دفتر خالصہ میں اسی کام پر معمور تھے۔ ان کی تاریخ نویسی کا زمانہ ۳۵ سال کے طویل عرصے پر محیط ہے۔انھوں نے ''تاریخ شاہ عالم'' جیسی معرکتہ الآرا تاریخ لکھی۔ یہ کتاب شاہ عالم کے ۳۱ سالہ دور حکومت پر مشتمل ہے۔اس میں واقعات ترتیب سے بیان کئے گئے ہیں۔اور کوئی واقعہ ادھورا نہیں نظر آتا۔اس کے کچھ سالوں بعد تک کے حالات بھی مختصراً بیان کئے گئے ہیں۔

(۱۴)بنوالی داس ولی:

بنوالی داس ولی کا شمار عہد شاہ جہانی کے مشہور شاعروں اور مورخوں میں ہوتا ہے۔ان کا نام بنوالی داس اور تخلص ولی تھا۔ان کی شہرت کا دارومداران کی معرکتہ الآرا تصنیف راجاولی ہے۔ یہ کتاب دوحصوں میں منقسم ہے۔

(۱۵)منشی سداسکھ نیاز:

فارسی زبان و ادب میں جن ھندو مورخین نے حصّہ لیا ان میں سے ایک منشی سداسکھ نیاز کا نام بھی سر فہرست ہے۔منشی جی نے اپنی تصنیف منتخب التواریخ میں انگریزوں کے سیاسی اور مذہبی افکار کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب دوحصّوں میں منقسم ہے۔

(۱۶)لال کشن دیال سکسینہ:

لال کشن سکسینہ کا شمار فارسی زبان وادب کے ھندو مورخ میں ہوتا ہے ان کی مشہور کتاب ''اشرف التواریخ'' ہے۔ یہ کتاب سات حصّوں میں منقسم ہے۔شروع کے چار حصے میں ھندو راجاؤں کی مکمل تاریخ کا ذکر ہے۔ پانچویں حصے میں سلاطین دہلی کے حالات ہیں جس میں اکبر ثانی کے عہد تک کی پوری تفصیل سے اس کا ذکر نمایاں ہے۔ چھٹے حصے میں ملک کی آمدنی اور ذرائع آمدنی کا ذکر ہے اور اس کتاب کا آخری حصہ تاریخ کے علاوہ جغرافیہ سے بھی تعلق رکھتا ہے۔اس حصے میں مشہور شہروں اور عجائبات کا تذکرہ ہے۔ یہ کتاب پانچ سال کی مدت میں مکمل ہوئی۔

(۱۷)رائے امرسنگھ خوشدل:

رائے امرسنگھ خوشدل کا شمار عہد شجاع الدولہ کے نامور اور مستند ترین مورخوں میں ہوتا ہے۔ان کو فارسی زبان و ادب پر کافی عبور حاصل تھا۔ ان کی تصانیف ''فرمانروایان ھنود'' اور ''بزم خیال'' ہے

(۱۸)کالی رام کائستھ:

راجستھان کے مشہور مورخ کالی رام کائستھ کا شمار فارسی زبان وادب کے ھندو مورخین میں ہوتا ہے۔ ان کی تصنیف ''تاریخ راجستھان'' ہے۔ یہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔اس کتاب کے پہلے حصے میں جے پور اسٹیٹ کے حکمرانوں کی تاریخ ہے۔دوسرے حصے میں اودے پور کے حکمرانوں کا ذکر ہے اور تیسرا حصّہ اجمیر، سندھ، دکن اور گجرات کے مشہور فوجی جنرلوں اور سرداروں پر مشتمل ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کتاب کا قلمی نسخہ ٹونک کی لائبریری میں محفوظ ہے۔

(۱۹)منشی سوہن لال سوری:

سوہن لال سوری کا شمار پنجاب کے مستند تاریخ نویسوں میں ہوتا ہے۔انکے والد راجہ رنجیت سنگھ کے دربار سے منسلک تھے۔سوہن لال نے اپنے والد کی نگارشات سے فائدہ اٹھایا اور سکھ قوم کی ایک مفصل اور جامع تاریخ فارسی زبان میں لکھی جس کا نام عمدۃ التواریخ رکھا۔ یہ کتاب چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ پنجاب کی تاریخ کے متعلق ہے اور باقی تین حصوں میں مہاراجہ رنجیت سنگھ اور اس کے دو جانشینوں کے مفصل حالات لکھے ہیں۔

ان کے علاوہ دوسرے بہت سے ہندو مورخین ہیں جنھوں نے فارسی تاریخ نویسی میں کارہائے نمایاں انجام دئے۔ ان ناموں میں پنڈت کرشنا نند، بدھ سنگھ، رگھوناتھ، موہن لعل انیس ہرنام سنگھ، منشی مہتاب سنگھ کائستھ، کرنل مہان، برج نرائن خیال، لالہ گوکل چند، ہرسکھ رائے، آنند رائے مخلص، منشی دولت رائے، دیوان کرپارام، سندر لعل کول وغیرہ کے نام مشہور ہیں۔

منابع:

۱۔ فارسی ادب میں ہندوؤں کا حصہ، سید عبداللہ

۲۔ تاریخ نویسی فارسی در ہندو پاک، دکتر آفتاب اصغر

3- History of Indo Persian Literature, Nabi Hadi

۴۔ قاموس المشاہیر، نظامی بدایونی

۵۔ تذکرۂ ماہ وسال، مالک رام

6- A History of Indo Persian Literature, S. H. Qasemi

❑❑❑

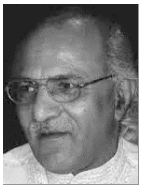

تصوف اور ہندوستانی روحانیت

ڈاکٹر نریش
۱۶۹، سیکٹر ۱۷، پنچ کولہ
موبائل: 9560364765

گیارہویں بارھویں صدی میں ہندوستان کی تاریخ میں ایک دلچسپ موڑ آیا۔ بیرونی ممالک سے بہت سے مسلمان ہندوستان آئے۔ ان میں سے بعض تیغ بکف تھے اور بعض تسبیح بکف۔ دونوں کا ساتھ ساتھ آنا بھی ایک اتفاق تھا اور دونوں کے آنے کا مقصد بھی الگ تھا۔ تیغ بکف مسلمان اس ملک پر قبضہ کرنے کے ارادے سے آئے تھے اور پوری منصوبہ بندی کر کے آئے تھے۔ تسبیح بکف مسلمان منگولوں کے حملوں سے افراتفری کا شکار ہوئے علاقوں سے ہجرت کر کے امن وسکون کی تلاش میں آئے تھے اور ان کا ارادہ اس ملک کو راہ مستقیم دکھانے کا تھا۔ قدرتی طور پر ہی یہاں کے عوام نے حملہ آور کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھا لیکن ان کو اپنے غم وغصہ کا اظہار جس شدید ردعمل کے طور پر کرنا چاہئے تھا وہ انہوں نے نہیں کیا۔ اس کی کئی وجوہ تھیں لیکن ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ تسبیح بکف مسلمانوں کی خدا پرستی، انکساری، بے غرض خدمت خلق اور انسان دوستی سے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ بجائے مسلمانوں سے نفرت کرنے کے وہ ان کے ہم بیعت ہو گئے۔ یہ تسبیح بدست مسلمان صوفیائے کرام تھے جن کے اقوال و اعمال میں ہندوستانی عوام کو ایمانداری اور سچائی نظر آئی اور ان کو محسوس ہوا کہ وہ تو انہیں کی بات کر رہے تھے۔

کیا کہہ رہے تھے صوفیا؟ یہی کہ اللہ ایک ہے، اللہ سے ڈرو، اللہ کو یاد کرو، اللہ سے عشق کرو۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ 'اللہ' ایک لفظ نہیں ہے، 'ال' اور 'الہ' دو لفظوں کا مرکب ہے۔ یہاں پر 'ال' کا استعمال اسی طرح سے ہوا ہے جس طرح سے انگریزی میں کسی لفظ سے پہلے 'دی' لگا کر اسے اسم نکرہ سے اسم معرفہ بناتے ہیں۔ 'ال' کو ہٹا دیں تو باقی رہتا ہے 'الہ' جس کے معنی ہیں قابل پرستش۔ صوفیائے کرام کی باتیں سن کر یہاں کے عوام کو یاد آیا کہ ان کے رشیوں نے بھی خدا کو الہ ہی کہا ہے۔ رِگ وید میں خدا کے لئے 'ایلیہ' لفظ کا استعمال ہوا ہے جس کے معنی معبود کے ہیں۔ یجر وید میں خدا کے لئے 'الہ' لفظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ یجر وید کہتا ہے، 'نمستے الام استو' یعنی میں الہ کو نمسکار کرتا ہوں۔ صوفیاء کہتے تھے، اللہ ایک ہے۔ یہاں کے لوگوں کو خیال ہوا کہ ان کے رشی بھی یہی کہتے رہے ہیں کہ 'ایکو برہتم دویتا ناستی' خدا ایک ہے، دوسرا کوئی نہیں ہے۔ صوفیاء کہہ رہے تھے، اس کی کوئی شکل نہیں ہے۔ یجر وید بھی یہی بتا رہا ہے کہ 'نہ تسیہ پرتما استی' یعنی وہ بے پیکر ہے۔

ہندوستانیوں کے ان اعتقادات کی روشنی میں دیکھا جائے تو آدھا کلمہ تو وہ نزول اسلام سے قبل ہی پڑھ چکے تھے۔ صوفیاء نے ان پر رسول کی حیات طیبہ روشن کی تو ان میں سے بہت سے لوگوں نے پورا کلمہ بھی پڑھ لیا۔ قرآن میں اگرچہ ہندوستان یا ہندو مذہب کا کوئی حوالہ دستیاب نہیں ہے لیکن اس سے یہ مطلب نکالنا کہ رسول پاک یا ان کے مقلدین کو ہندوستانی نظریۂ وحدانیت کا علم نہیں تھا، قطعی نامناسب ہوگا۔ ایک حدیث کے مطابق رسول نے ہندوستان کی جانب رخ کر کے فرمایا تھا کہ مجھے اس طرف سے خدا کی خوشبو آ رہی ہے۔ اسی حدیث کے تعلق سے علامہ اقبال نے ہندوستان کے بارے میں کہا تھا:

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

یہاں ہم اس سوال پر غور کر سکتے ہیں کہ جہاں قرآن میں مختلف قوموں اور مختلف ممالک کے مروجہ مذاہب اور پیغمبروں کا ذکر ہوا ہے وہاں ہندوستان کے کسی اوتار کا ذکر کیوں نہیں ہوا۔ یہ سوال اس امر کی روشنی میں اور بھی اہم ہو جاتا ہے کہ زمانۂ قدیم ہی سے ہندوستان اور عرب کے تعلقات کافی گہرے رہے ہیں۔ میرے خیال میں اس کی دو وجوہ ہیں۔ اول یہ کہ اس زمانے میں ہندو دھرم کسی منظم مذہب کی صورت میں موجود نہیں تھا اور دیگر قوموں کی طرح ہندو قوم کے پاس کوئی ایک مقدس کتاب نہیں تھی۔ ہندو دھرم در اصل اس قسم کا مذہب نہیں ہے جس قسم سے عیسائی، اسلام یا پارسی مذاہب ہیں۔ درحقیقت زندگی کے فطری طریقے کو ہندو دھرم کا نام دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے آئین سازوں کو جب ہندو کی تعریف درج کرنا پڑی تو ان کو اس وضاحت پر اکتفا کرنا پڑا کہ ہر وہ شخص جو نہ مسلمان ہے، نہ عیسائی، نہ پارسی، وہ ہندو ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی منظم مذہب کے طور پر ہندو دھرم کا اسلام کے تعلق میں آنا ممکن ہی نہیں تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو ہندو نام تو غیر ہندوستانیوں نے دیا ہے۔ اسی بنا پر ان کے مذہب یا طریق عبادت کو ہندو مذہب کہہ دیا گیا۔ دراصل یہاں کے لوگوں کا مذہب تو

'سناتن دھرم' تھا جو عام معنوں میں کوئی مذہب نہیں تھا بلکہ سناتن یعنی ابدی سچائیوں پر مبنی ایک طریق حیات تھا۔غور سے دیکھا جائے تو حضرمحمد نے بھی انہیں ابدی سچائیوں کی تصدیق اپنے روحانی مشاہدات کے مطابق کی تھی۔ حضرت محمد کا پیغام وہی ہے جس کی طرف ابتدائے کائنات سے لے کر ہر سچ کا بلاوا دینے والوں کو بلاتا رہا ہے اور آپ نے اسی فطری مذہب کی تلقین فرمائی۔خود رسول پاک نے بھی کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ کسی نئے مذہب کی داغ بیل ڈال رہے تھے بلکہ وہ تو فرماتے تھے کہ وہ بہت پہلے سے چلی آرہی روایت کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

صوفیاء بنیادی طور پر فقیر تھے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ صحیح معنوں میں فقیر تھے۔فقیر کی تعریف اس لفظ کے چار حروف کے اندر پوشیدہ ہے۔فقیر وہ ہے جو فاقے کرتا ہو(ف)، جو قناعت شعار ہو(ق) جو ہر وقت یاد الٰہی میں منہمک رہتا ہو(ی) اور ریاضت ہی جس کا مشغلہ ہو(ر) صوفیائے کرام نے یہ کہا ہی نہیں، کر کے بھی دکھایا۔ان کی بے مثال قناعت کا عالم یہ رہا کہ ان کی خانقاہوں میں جو بھی فتوحات موصول ہوتی تھیں، ان میں سے حسب ضرورت کو استعمال کر کے بقیہ سب غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔اگر کسی روز کہیں سے کچھ بھی نہیں آتا تھا تو خانقاہ میں فاقہ ہوتا تھا۔

ایک واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت نظام الدین اولیاء حضرت شیخ فرید کی درگاہ میں رہ کر ان کے زیر نگرانی ریاضت کر رہے تھے تو کئی روز تک فتوحات میں کھانے پینے کا سب سامان آیا لیکن نمک نہیں آیا لہٰذا کھانا بغیر نمک کے پک گیا اور کھا لیا گیا۔یہ سلسلہ دو تین روز تک جاری رہا تو حضرت نظام الدین کو بڑی تکلیف ہوئی کہ یہ پھیکا کھانا میرے حلق ہی سے نیچے نہیں اتر رہا ہے تو میرے مرشد اس کو کیسے کھا رہے ہوں گے۔لہٰذا وہ چپکے سے درگاہ سے باہر نکلے اور بنئے کی دکان سے ایک درم کا نمک ادھار لے آئے اور لا کر دیگ میں ڈال دیا۔درگاہ کا دستور یہ تھا کہ تمام ساکنین ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے اور کھانا شیخ فرید کے پہلا لقمہ منہ میں ڈالنے پر شروع ہوتا تھا۔شیخ فرید نے لقمہ دال میں ڈبویا مگر منہ تک جاتے جاتے ان کا ہاتھ رک گیا۔حضرت نے کہا، 'لقمہ بھاری ہو رہا ہے۔اس میں باہر کا کیا ہے؟' سب کے سب خاموش بیٹھے رہے۔ حضرت نے لقمہ رکابی میں رکھ دیا اور اعلان کیا کہ آج خانقاہ میں فاقہ ہوگا۔کھانا باہر مسکینوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ بابا فرید اپنے حجرے میں چلے گئے تو نظام الدین کو بڑی ندامت ہوئی۔وہ اشکبار بابا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے قدموں پر گر کر ایسا کرنے کی وجہ بیان کی۔ بابا نے کہا، توبہ کرو۔ یہ غلطی تم سے دوبارہ نہیں ہوگی۔تمہاری اس حماقت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پر تمہارا پختہ ایمان نہیں ہے۔ چونکہ تم کو معلوم ہے کہ تم کل بنئے کا اودھار چکانے کے لئے زندہ رہو گے۔ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اگر تم کو اگلا سانس نہ دے تو تم کیا کر لوگے۔ قیامت کے روز بنئے کا ہاتھ تمہارے دامن پر ہوگا۔ نظام الدین نے اپنے مرشد کا ارشاد گانٹھ باندھ لیا اور جب انہوں نے غیاث پور میں اپنی خانقاہ قائم کی تو تمام عمر سختی سے اپنے مرشد کی نصیحت پر عمل کیا۔

یہ ایک واقعہ ہی نہیں، اس قسم کے متعدد واقعات صوفیائے کرام کے حوالے سے کتابوں میں درج ہیں۔

چشتی صوفیاء کی درگاہوں میں جن نو اصولوں پر سختی سے عمل کیا جاتا رہا ہے ان میں سے ایک اصول یہ تھا کہ اپنے پاس جو کچھ بھی اپنی ضرورت سے زیادہ ہو، اسے شام ہوتے ہی غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ فردوسی صوفیاء کی درگاہوں میں جن چھ اصولوں پر پہرہ دیا جاتا تھا ان میں سے ایک اصول یہ تھا کہ خود بھوکے رہ کر بھی دوسروں کا پیٹ بھرا جائے۔ غرض کہ یہ صوفیائے کرام عملاً وہ سب کچھ کرتے تھے جس کے کرنے کی تلقین وہ دوسروں کو کیا کرتے تھے۔ان کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہ تھا۔ ہندوستان کے روحانی فلسفے کا بنیاد نقطہ بھی 'اپریگرہ' ہے یعنی کسی صورت میں بھی دنیاوی اشیاء کو جمع نہ کیا جائے۔اس فلسفہ کا دوسرا اہم نقطہ 'دان' ہے۔'دان' خیرات دینا نہیں ہے۔'دان' کی تعریف 'دانم سم وبھاجنم' ہے یعنی جتنا کچھ آپ اپنے پاس رکھ رہے ہیں، یقین کر لیجئے کہ دوسروں کے پاس بھی اتنا ہی کچھ ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہیں تو اپنی ضرورت سے زیادہ جو کچھ آپ کے پاس ہو، اسے دوسروں میں تقسیم کر دیا جائے۔

صوفیائے کرام خدمت خلق خدا کی تلقین ہی نہیں کرتے تھے، اس پر عمل پیرا بھی تھے۔ان کی محبت انسانوں تک ہی محدود نہیں تھی، وہ چرند و پرند پر بھی اپنی محبت لٹاتے تھے۔ روحانی پیشوائے ہند بھی یہی درس دیتے ہیں:

سروے بھونتو سکھنا سروے سنتو نرامیا
سروے پشیتی بھدرانی ماکشچد دکھ بھاگ بھویت

(دنیا کا ہر شخص سکھی ہو، ہر شخص تندرست رہے، ہر شخص کو حق کی پہچان ہو، کوئی شخص بھی دکھی نہ ہو) یہاں کے رشیوں نے تمام عالم کو ایک کنبے کے طور پر دیکھا ہے۔'وسیودھیو کٹمبکم'

صوفیاء کا 'ذکر' اور 'سماع' بھی ہندوستانیوں کی بھکتی کے مشابہ تھا۔شریمد بھاگوت گیتا میں عبادت کے جو نو طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ان میں پہلے دو طریقے 'شرون' اور 'کیرتن' ہیں یعنی ذکر الٰہی کو سننا اور مجموعی طور پر اس کی حمد و ثنا کرنا۔تیسرا طریقہ ہے 'اسمرنم' یعنی ہر وقت اس کو یاد کرنا۔ ذکر الٰہی اور یاد الٰہی کی جو تلقین صوفیائے کرام کرتے تھے، وہی تلقین تو یہاں کے رشی کرتے رہے تھے۔

اپنے روحانی فلسفے کے ساتھ تصوف کی اتنی گہری مشابہت دیکھ کر ہندوستانی عوام کو صوفیاء سے

عقیدت ہوگئی۔عقیدت کا یہ جذبہ اس قدر افزوں ہوا کہ بہت سے مٹھوں کے مہنتوں نے بہ اصرار صوفی بزرگوں کو اپنے مٹھوں کے قریب آباد کیا۔ اس کی دو مثالیں پنجاب میں آج بھی موجود ہیں۔ ہتھن کے ویشنو ڈیرے میں تب تک ڈیرے کے موجد بابا شیام دامودر کی سمادھی پر دیا نہیں جلایا جاتا جب تک ڈیرے کے صدر دروازے پر موجود حضرت کمالی کے مزار پر دیا نہ جلائے جائے۔ دوسری مثال رائے کوٹ کے ویشنو ڈیرے کی ہے جہاں پر ڈیرے میں داخل ہونے سے قبل ڈیرے کے باہر موجود 'سائیں کے تکئے' کو سلام کرنا لازمی ہے۔

تصوف کی ابتدا رسول پر ایمان لانے سے ہوتی ہے۔شروع شروع میں ان لوگوں کو صوفی کہا گیا تھا، جو رسول کی محبت میں ان کے ہمراہ مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ آئے تھے اور رسول کی بنوائی ہوئی مسجد کے باہر چبوترے پر بیٹھ کر یاد الٰہی میں منہمک رہا کرتے تھے۔ یہ لوگ رسول ہی کو پہلا صوفی مانتے تھے۔ان کا عقیدہ تھا کہ جس کیفیت کے دوران رسول پر قرآن نازل ہوا تھا، وہی کیفیت اعلیٰ ترین کیفیت ہے۔ہجرت کیوقت تک ان روحانیت پرست اصحاب صفہ کا نہ کوئی الگ طبقہ تھا، نہ تصوف ہی ایک فلسفہ کے طور پر ظہور میں آیا تھا۔ قیام مدینہ کے دوران یہ حضرات ایک دوسرے کے قریب بھی آئے اور ان کی الگ شناخت بھی قائم ہوئی۔آس پاس کے علاقے میں جیسے جیسے ان حضرات کا اثر بڑھتا گیا، ان کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ پھر خانقاہیں وجود میں آئیں جو تصوف کے مراکز بنیں۔ یہ خانقاہیں ہندوستانی رشیوں کے آشرموں کے مشابہ تھیں، جہاں پر روحانیت کی ترغیب وتلقین ہی نہیں ہوتی تھی، باقاعدہ ریاضت بھی کروائی جاتی تھی۔عوام کے دلوں میں ان آشرموں اور خانقاہوں کے لئے جو تقدس آج تک موجود ہے، کی بڑی وجہ بھی یہی ہے۔آج ہندوستان کے جن علاقوں میں مسلمان نہیں بھی رہتے ہیں، وہاں پر بھی بزرگان دین کی درسگاہوں کا تقدس قائم ہے اور لاکھوں کی تعداد میں غیر مسلم ہندوستانی وہاں پر سربہ سجدہ ہورہے ہیں۔

صوفیاء عشق و محبت کی تصویر ہوتے تھے۔

تحلیل ہوئے بن کے دھواں، شہر میں ایسے
ہم پھر نہ گئے گاؤں، کبھی گھر نہیں دیکھا

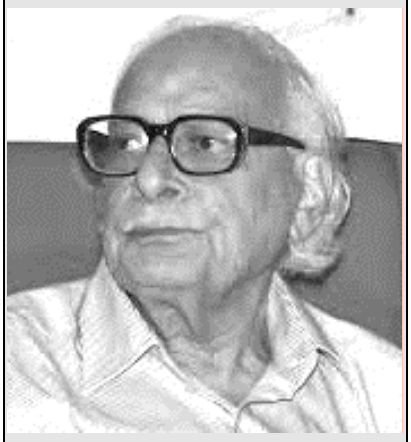

معروف ادیب، شاعر، نقاد اور صحافی
فضیل جعفری بھی نہیں رہے۔
ان کا شمار اردو کے نمائندہ دانشوروں میں ہوتا تھا۔ان کی غیر ادبی تحریریں بھی ادبی ذوق وشوق سے پڑھی جاتی تھیں۔
ادارہ 'نیا دور' جلد ہی فضیل جعفری کی
ادبی خدمات پر ایک شمارہ معنون کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جس میں **اسرار گاندھی، علی احمد فاطمی** وغیرہ کے مضامین شامل رہیں گے

یہاں پر میں دانستہ اس ترکیب کا استعمال کررہا ہوں چونکہ یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ عشق اور محبت مترادف الفاظ نہیں ہیں۔محبت ایک فطری جذبہ ہے، جو ہر ذی روح کے اندر موجود ہے۔ والدین اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں، بھائی اپنی بہنوں سے محبت کرتے ہیں۔انسان ہی نہیں، چرند و پرند میں بھی محبت کا یہ جذبہ موجود ہوتا ہے لیکن محبت عشق تب بنتی ہے جب اس میں جنون شامل ہوجاتا ہے۔صوفیاء خدا سے محبت نہیں، عشق کرتے تھے، محبت ان کو خلق خدا سے تھی، جس کی فلاح و بہبود کے لئے وہ ہمہ وقت کوشاں رہتے تھے۔ ہندوستانی روحانیت میں بھی 'پریما بھکتی' کا جو تصور موجود ہے، اس میں بھی عشق الٰہی میں خود کو کھودینے کی شرط موجود ہے۔محبت میں 'میں' 'میں' رہتا ہے اور 'تو' 'تو' رہتا ہے لیکن اگر عشق ہوجائے تو بقول امیر خسرو:

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

یہی آخری منزل ہے تصوف کی بھی، ویدانت کی بھی۔کبیرؔ کے لفظوں میں:

پانی ہی تے ہم بھیا، ہم ہوئے گیا بلائی
جو کچھ تھا سوئی بھیا اب کچھو کہیو نہ جائی

پانی ہی تھا جو جم کر برف بن گیا تھا۔ برف پگھل گئی تو پانی پھر پانی ہوگیا۔خدا کا جلوہ ہی تھا جس نے اس کے 'کُن' کہنے پر مختلف شکلیں اختیار کرلی تھیں۔ ریاضت کے آخری مقام پر جب روح انسانی فضا کے ذریعہ بقا کو پہنچتی ہے تب اسی صورت کو جا پہنچتی ہے جو اس کی 'کُن' کے حکم سے پہلے تھی۔یہی 'ساکشا تکار' ہے۔ اسی کو 'وصال' کہتے ہیں۔

آج ہمارا ملک اور ہمارا معاشرہ باہمی تنفر اور تعصب کے جس خطرناک دور سے گزر رہا ہے اور جس قدر اعلیٰ انسانی قدریں پامال ہو رہی ہیں، ضرورت ہے صوفیائے کرام کے پیغام کو عام کیا جائے تاکہ آدمی پھر سے انسان بننے کی آرزو کرنے لگے، محبت کے کچے دھاگے پھر سے عوام کو انسانیت کے رشتے میں باندھنے لگیں، ایک بہتر صحت مند معاشرہ تعمیر ہو جس میں انسان کی ہوس کی تحدید ہو اور روحانیت کی تجدید ہو۔

□□□

اردو شاعری میں پروازِ تخیّل کے زاویے

کرشن بھاؤک
کوٹھی نمبر ۲۰۱، گرونانک نگر، پٹیالہ (پنجاب)
موبائل: 9815165210

انگریزی کے شہرۂ آفاق ڈرامہ نگار شیکسپیئر کا یہ مشہور و معروف قول تھا کہ ایک شاعر کی نگاہ زمین سے لے کر فلک تک گھوما کرتی ہے اور اسکی زد سے کچھ بھی نہیں بچا کرتا ہے۔ ایسا اعلان کرتے ہوئے اس نے عموماً ایک شاعر کے بے مثال تخیل کی ہی بلا شرط پذیرائی کی تھی۔ اردو شاعری کا دائرہ آج اتنا وسیع اور لامحدود ہو چکا ہے کہ اردو اور قومی زبان ہندی دونوں کے معرض کی حد بندی لائن مذہبی دیواروں کا تجاوز کر کے کبھی مفقود ہی ہو چکی ہیں۔ ہندی غزل کے بانی کہلائے جانے والے شری دُشینت کمار اس بلند پایہ مقام کو حاصل بھی صرف اسی لیے کر سکے تھے، کیونکہ ان کی تمام غزلوں کی بنیاد میں اردو و فارسی کی بحروں کا پختہ و مستحکم سیمنٹ اور سنگ و خشت لگے ہوئے تھے۔ جس غزل سے ہندی دنیا میں انکی ایک غزل گو کی حیثیت سے پہلی شناخت ہوئی، اس کا یہ مطلع بے حد مشہور و معروف ہوا تھا۔

کہاں تو طے تھا چراغاں ہر ایک گھر کے لیے
کہاں چراغ میسّر نہیں شہر کے لیے

یا پھر انہیں کا یہ شعر بھی از حد مشہور و معروف ہوا:

کیسے آکاش میں سوراخ نہیں ہو سکتا
ایک پتھر تو طبیعت سے اُچھالو یارو

یہاں مبالغہ آرائی کے باوصف تخیل کی پرواز قابلِ صد ستائش ہے۔ بعد ازاں گوپال داس نیرج، شمشیر بہادر سنگھ، منور رانا، راجیش ریڈّی، کنور بے چین وغیرہ سینکڑوں غزل کہنے والوں نے ہندی میں غزلیں نہ صرف کہی ہیں بلکہ مشاعروں میں ترنّم سے گا گا کر اور ان میں اردو، عربی و فارسی کے الفاظ کی آمیزش کر کے زبان کے علاقے میں بھی قومی یکجہتی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ایک شاعر بصورت طائرِ تخیّل کے لامتناہی فلک پر جو پروازیں کیا کرتا ہے، اسکے متعددّ زاویے، تحقیق اور تفتیش اور مواد و موضوع کے علاوہ اسلوب کے بھی مدنظر ممکن ہو سکتے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون اسی امر کی توثیق و تائید میں ایک بے نظیر و نادرِ سعی مانی جا سکتی ہے۔ اسی کی تصدیق کرنے کے مدِّ نظر تخیّل کی پرواز کے چند زاویوں کی خط کشی اس سے آگے چند عنوانوں کے تحت کرنے کی کوشش آگے کی جا رہی ہے:

۱۔ موضوع کا زاویہ

۱۔ خدا پرستی کا جذبہ

خدا کی عظمت اور اسکی ہستی کو لے کر انسان کے ادراک کا دائرہ شروع ہی سے بے حد محدود و تنگ رہا ہے تاہم شعرا اس علاقے میں بھی اپنے اسپِ تخیّل پے در پے دوڑاتے ہی رہے ہیں اور ایک سے بڑھ کر ایک سوچ و تصوّر کے گہر و جواہر تخیّل کے سمندر سے نکال کر شاعری کے دلدادہ افراد کی خدمت میں پیش کر کے واہ واہیاں لوٗٹتے رہے ہیں۔ کرشن بہاری نورؔ ایک بے مثال تشبیہ کی مدد لیتے ہوئے اس قدرتی تجربے کے توسط سے خدا کی لاثانی و لافانی ذات کی بابت یہ شعر کہتے ہیں۔

اب کیا بتائیں کیسی عظیم اسکی ذات ہے
ساگر کو سیپیوں سے اُلچنے کی بات ہے

یہاں نصب العین یا مقصود و مفہوم یہ ہے کہ خدا کی ذات بعید از قیاس و گفتنی ہی ٹھہرتی ہے۔ جو شخص بالخصوص، ایک شاعر اس خالقِ دنیا کی ذات سے منسلک ہو جاتا ہے، وہ اسکی ہر ایک چیز کے ساتھ اپنی وحدت قائم کر کے ایک جان و ایک روح ہو جانا چاہتا ہے۔ اسی شاعر نے اس شعر میں یہ اعلان کیا ہے:

شاعری تیری عبادت کے سوا کچھ بھی نہیں
کر رہا ہوں میں تپسیا کسی سادھو کی طرح

اسی طرح دیگر شعرا بھی اساطیری قصوں اور واقعات وغیرہ کی اساس پر اشعار کے قصرِ ایستادہ کرتے رہے ہیں۔

عشق آدمی کو کئی بار حد درجے کی انا و خودی سے بھی آراستہ کر دیا کرتا ہے۔ شاعر طارق متین بھی کہتے ہیں۔

مولا سے لو لگانے کا انعام دیکھئے
دنیا کو مجھ فقیر کی ٹھوکر میں رکھ دیا

طنز و مزاح میں ید طولیٰ رکھنے والے جناب ٹی این رازؔ کا بھی خدا پرستی کے ایسے ہی سنجیدہ جذبے سے مملو شعر ملحوظِ خاطر یہ ہے۔

بیٹھا کہیں پہ سب کو نچاتا ہے رات دن
ٹھ پتلیاں ہیں ہم تو فقط اس کے ہاتھ کی

محترمہ ظنی وبھا نازلی کے تخیّل میں سیّاروں کا تصوّر کچھ یوں ابھرتا ہے۔

چاند عنوان، تو انجم ہیں حروف
ہے خدا ایک سخنور کی طرح

(مجموعہ 'حرف حرف آئینہ'، صفحہ 37)

جمیل مظہری کا بھی یہ شعر قابلِ تحسین ہے۔

سر بلندی اُسے ملی مظہرؔ
سر جھکا جس کا بندگی میں ملا

یہ ایک شعر سیاسی اشتراکیت کے پروردہ لوگوں کے تئیں نعروں اور تبلیغ کا ذریعہ رہا ہے:

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے ، جسے روشن خدا کرے

(حفیظ جونپوری، 'حیات وشاعری'، ص28)

اس تاریخی اور نمائندہ شعر کے خالق کے طور پر کہیں مقری شاہ بابا کے نام سے اسے منسوب کیا جاتا ہے، تو کسی محقق کے بموجب یہ جناب مشیر مچھلی شہری کی شہرت کا ہی مظہر یا باعث رہا ہے۔

جناب خلیق الزماں نصرتؔ نے اسے اپنی عرق ریزی والی تنقیدی کتاب 'برمحل اشعار اور انکے ماخذ' میں بھی اس کے خالق کا مشیر مچھلی شہری نام ہی (سنہ طباعت دوم، مارچ سنہ 2011 صفحہ 112 پر) اعلان کیا ہے اور متن بھی یہی ہے۔ اس کتاب کے تا حال کئی ایڈیشن منظر عام پر ظہور پذیر ہو چکے ہیں۔

آرزوؔ لکھنوی صاحب نے اپنے اس شعر میں خدا کی ہی عنایات کے تئیں اپنا شکرانہ یوں ہویدا کیا ہے:

سوکھے پتے جھاڑ کر سرسبز ہوتے ہیں شجر
جتنا کچھ لٹتا رہا، اس سے زیادہ مل گیا

۲۔ محبوب کے عشوے، ناز و ادا

اردو شاعری میں عاشقوں سے کہیں زیادہ ان کے محبوب کے عشووں کی حقیقت بیان ہوتی رہی ہے۔ مثلاً مرزا غالبؔ کا یہ ایک شعر بھی اسی زمرے میں شمار کیا جاسکتا ہے:

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

امیرؔ مینائی کے یہاں بھی ایسی لا تعداد حسینائیں مل جاتی ہیں، جن کی بابت معشوق کے تاثر کچھ اِس نوعیت کے ہوا کرتے ہیں۔

تسلی خاک ہو وعدوں سے ان کے، چتونیں انکی
اشاروں سے یوں کہتی ہیں کہ دیکھو یوں مکرتے ہیں

اِسی طرح اخترؔ کاظمی کے اگلے دو اشعار حسیناؤں کی دلکش ناز و ادا کی ہی شیریں بیانی کر رہے ہیں:

وہ حسن یار کی خوبی کہ جس کے قدموں میں
سپاہی تیغ ، تو فنکار اپنا فن رکھ دے

بجھی بجھی سی تمنا کے سرد ہونٹوں پر
کبھی تو اپنے لبوں کی کوئی تپن رکھ دے

ظہیرؔ غازی پوری بھی اپنی محبوبہ کے چشم اٹھانے کو ہی گویا قیامت خیز اثر تصورؔ کرتے ہیں۔

زلزلہ شہر بدن میں آیا
اِس طرح آنکھ اٹھائی کس نے

کہتے ہیں عورتوں کی نظریں تیر کی ہی مانند تیز و طرار ہوا کرتی ہیں۔ اسی ضمن میں دو اشعار قابلِ غور ہیں۔

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو تو چھوڑ دئے مسکرا کے ہاتھ

(نظامؔ رامپوری)

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تیری انگڑائی کا

(عزیزؔ لکھنوی)

جُرأت کا بھی یہ شعر اسی زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔

عبث انگڑایاں لے لے کے ملتے ہو آنکھوں کو
بھلا یہ بھی تو گھر ہے سو رہو، گر نیند آئی ہے

ایک ساقی یا اُسکی مانند ہی کسی ایک محبوبہ کی بھی یہ بلا کی شیریں ادا قابل ناز کہی جاسکتی ہے۔

دینا کسی کا ساغر مے یاد ہے نظامؔ
مُنھ پھیر کے اُدھر کو، اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

اس ضمن میں بھی لاتعداد اشعار کا خزینہ اردو شاعری کے پاس محفوظ ہے۔ ایسے اشعار کے تئیں بے اعتنائی کیے بغیر ہمیں ان کے مفہوم اور بالخصوص نازنینوں کی حرکات وسکنات کو ہمیشہ منقوش خاطر کرنا درکار ہوا کرتا ہے۔

۳۔ عشق وحسن کے زاویے

اردو شاعری میں ان زاویوں سے جتنا بے بہا اور بیش قیمت سرمایہ بصورتِ خزانہ اردو زبان کی شاعری میں محفوظ ہے، وہ شاید دنیا کی تمام دیگر زبانوں سے موصول ہونے والی شاعری کے مساوی یا متوازن ہوگا یا پھر اس سے بھی کہیں زیادہ ثابت ہوسکتا ہے۔ محبوب کے مختلف ناز وعشوہ کو متعدد پیرایوں سے بیان کرنے کا کام ہو، یا پھر ایک عاشق کے ذریعہ اسکی موت، بیماری، ضعیفی، بے چینی، تڑپ وغیرہ کی جاندار عکاسی کرنے کا مرحلہ ہو، اردو زبان کے شاعروں کے قلموں نے نایاب گوہر لٹائے ہیں۔ مثلاً ہر ایک شخص محبّت کرنے کے لیے درخور یا مستحق نہیں ہوا کرتا ہے، اس ایک جذبے کو خمارؔ بارہ بنکوی کا نفسیاتی انداز میں بیان کرنے والا یہ بے نظیر شعر بھی پڑھئے اور سر دھنئے:

محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پہ گایا نہیں جاتا

کیا تشبیہ اور کیا تخیل اور کیا تجربے کے آتشدان سے تپ کر دستیاب ہونے والا اور بصورت کُند تپے ہوئے سونے جیسا یہ ایک مخصوص قلیل، منفرد اور منفصل احساس ہے۔ اس احساس کی ترجمانی کرنے والے اشعار کا استعمال تو ایک متجسس شوقین شاعر سے تو کوئی چراغ لے کر تلاش کرنے پر بھی ممکن نہیں ہوسکتا ہے۔ سنسکرت زبان میں آچاریہ ممّٹ نے شاعری کے بنیادی لوازمات کا تعین کرتے ہوئے ایک خاص بات یہ بھی کہی تھی کہ کچھ خاص اشخاص ہی کاویہ (شاعری) کے سرور وکیف سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں، سبھی لوگ کبھی نہیں۔ ٹھیک یہی بات محبت جیسے قدیم و ابدی

جذبے پر بھی کاملاً صادق آتی ہے۔

اگرچہ ہر ایک عاشق کو بسا اوقات اپنے محبوب سے اپنے پاک و شفاف عشق کے عوض فقط بے وفائی ہی ملتی رہی ہے، تاہم وہ بہ ایں ہمہ مطلق حراساں و پریشاں نہیں ہوتا ہے بلکہ اس پر زیادہ سے زیادہ شیریں طنز بھی کرنے کی بجائے فقط اسکی تعریف کر کے ہی رہ جایا کرتا ہے، مثلاً اس کا کہنا کچھ یوں رہتا ہے۔

یہ کس نے قبر پہ آنسو گرا دیے مختار
کہ رشکِ طور ہے میرا مزار کیا کہنا

(مختارؔ ٹونکی)

اسی شاعر کی مانند کسی نامعلوم شاعر کا یہ ایک شعر تھا۔

ہائے کس ناز سے وہ پھول چڑھانے آئے
اللہ اللہ دلہن بن گئی تربت میری

بطور ایک عاشق ابراہیم اشکؔ تو اپنے محبوب کا آئندہ جنم تک بھی انتظار کرنے کے لئے تیار ہیں۔

اِک عمر اور مانگ رہا ہوں خدا سے میں
اک عمر کاٹ دی ہے تیرے انتظار میں

ڈاکٹر قمرؔ تو خدا کی بابت انتہائی عاجزی سے اتنی ہی گذارش کرتے ہیں:

خدا نے اتنا کرم اور کر دیا ہوتا
کہ جس نے زخم دئے اس کو بھول جاتے ہم

خمارؔ بارہ بنکوی کا یہ مبالغہ آمیز اور متضاد بیان بھی ملاحظہ کریں۔

وہ سوا یاد آئے بھلانے کے بعد
زندگی بڑھ گئی زہر کھانے کے بعد

متوسط زمانے میں عاشقوں کو عوامی قصوں میں اکثر اپنے محبوبوں کی قدم بوسی کرتے ہوئے دیکھا جاتا ہے۔ مرزا داغؔ شاید اسی روایت سے بخوبی واقف ہونے کا گویا ثبوت فراہم کرتے ہوئے یہ ایک خاص شعر کہتے ہیں۔

غش کھا کے داغؔ یار کے قدموں پہ گر پڑا
بے ہوش نے بھی کام کیا ہوشیار کا

داغ ہی کا شعر ہے۔

کیا خاک لڑیں گی مرے دل سے تیری آنکھیں
جو شرم سے جھکی ہیں جو چھپتی ہیں حیا سے

محبوب کا بے پناہ حسن عاشق کے لیے ہمیشہ پُرکشش و جاذب نظر رہا ہے۔ تبھی قتیلؔ شفائی کے تخیل کی یہ پرواز مقبولِ عام ہو سکی تھی۔

گنگناتی ہوئی آتی ہیں فلک سے بوندیں
کوئی بدلی تیری پازیب سے ٹکرائی ہے

یہاں مصرع اول میں شاعر قاری کو فلک پر لے جاتا ہے اور مصرع دوم میں اسے زمین پر لا پٹکتا ہے۔

مختارؔ ٹونکی کا مبالغہ آرائی سے مملو شعر ہے:

ہر سمت ہے اب دھوپ کہاں جاؤنگا یارو
رک جانے دو زلفوں کی یہاں چھاؤں گھنی ہے

مظفرؔ حنفی عموماً شعرا فلسفیانہ انداز میں بھی اس پرورش کردہ قوت کی بابت کہتے ہیں:

عمر بھر ساتھ رہا پھر بھی نہ پہچان سکا
کس نے لکھا ہے مجھے، کس کی کتابت ہوں میں

شاعر جنت میں بھی خدا کی حضوری کو ایک لازمی شرط قرار طے کرتا ہے، ورنہ وہ اسے بھی جہنم کے ہی برابر گردانتا ہے۔ صوفی بان کوٹی کا یہ شعر جنت کے بارے میں خدا پرستی سے لبریز اسی امر کی توثیق کرنے والا مانا جائے گا۔

یہ مانا راحتیں ساری میسّر ہیں وہاں لیکن
حضوری جب نہ ہو تیری، تو جنّت بھی ہے

عاشق رقیب سے اپنے محبوب کے گھر کا پتہ تک ہمیشہ پوشیدہ رکھنے کا خواہشمند ہوا کرتا ہے۔ تبھی غالبؔ نے فرمایا تھا:

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

لالہ مادھو رام جوہرؔ نے ایک شاندار شعر میں قدیم اور جدید عاشقی کے ہی نمایاں امتیاز کو ان الفاظ میں یوں قلم بند کیا تھا:

اب عطر بھی ملو تو محبت کی بو نہیں
وہ دِن ہوَا ہوئے کہ پسینہ گُلاب تھا

(اِنتخابِ کلامِ جوہرؔ، ص۔20)

کبھی کبھی محبوبہ بھی بڑے ہی ناز سے اپنے عاشق سے کسی بات کا گِلہ یا شِکوا کرتا ہے اور وہ بھی ایسے وقت میں جب کہ عاشق اس کے احسان کو ماننے یا اٹھانے کے لائق ہی نہیں رہتا ہے۔

اِتنا ہی نہیں اگر یہ طنز اس نے اسے پہلے کبھی کیا ہوتا، تو وہ اس پر سو جان سے نثار ہوا ہوتا مثلاً وہ کہتا ہے:

آئے جو میری لاش پہ، وہ طنز سے بولے
اب ہم ہیں خفا تم سے، کہ تم ہم سے خفا ہو۔

(امیرؔ مینائی)

داغؔ کا یہ مقبول و معروف شعر عشق کے دو ساحلوں کی بات کرتا ہے۔

وقت دو مجھ پر کٹھن گزرے ہیں ساری عُمر میں
اِک ترے آنے سے پہلے، اِک ترے جانے کے بعد

کبھی کبھی شاعر ایک دو یا معدودے چند الفاظ سے کھیلتا ہوا کوئی باریک سی بات کہہ جایا کرتا ہے مثلاً صفیؔ اورنگ آبادی کا یہ شعر منقوشِ خاطر کریں۔

جان جاتی تو نہ ہوتا مجھے دُکھ اِتنا صفیؔ
رُوٹھ کر ہائے مرے گھر سے کسی کا جانا

'جان کا جانا' اور 'مرنا' ان دو الفاظ سے کھیلتے ہوئے جوہرؔ تماپوری کے اس شعر کی بناوٹ اور بُناوٹ بھی قابلِ تحسین ہی ٹھہرتی ہے:

ہم عاشقوں کی یہ محبت عجیب ہوتی ہے
کسی کے پیار میں مرتے ہیں جان ہوتے ہوئے

غالبؔ نے تو بہت پہلے ترکِ تعلّق سے کہیں دشمنی کو ہی بہتر قرار دیا تھا۔

بقیہ ص ۴۶ پر...

فراق گورکھپوری
۱۸۹۶ء ۱۹۸۲ء

رباعیات

چڑھتی ہوئی ندی ہے کہ لہراتی ہے
پگھلی ہوئی بجلی ہے کہ بل کھاتی ہے
پہلو میں لہک کے بھینچ لیتی ہے وہ جب
کیا جانے کہاں بہا لے جاتی ہے

یہ شعلہ حسن جیسے بجتا ہو ستار
ہر خط بدن کی لو میں مدھم جھنکار
رنگین نگاہ سے کھل اٹھتے ہیں چمن
رس ہونٹوں کا پی کے جھوم اٹھتی ہے بہار

دوشیزہ بہار مسکرائے جیسے
موج تسنیم گنگنائے جیسے
یہ شان سبک روی یہ خوشبوئے بدن
بل کھاتی ہوئی نسیم گائے جیسے

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں

بیسوی صدی کے صف اول کے شعراء میں شمار رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری بہترین نقاد اور نثر نگار بھی تھے۔ بطور دانشور بھی انہوں نے اپنی ایک الگ شناخت قائم کر لی تھی اور وہ ترقی پسند تحریک میں بھی سرگرم تھے۔ انہوں نے عشق، فلسفہ اور صوفیانہ شاعری کے علاوہ کسانوں، مزدوروں، کام گاروں، محنت کشوں، اور حب الوطنی کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ہندو دیومالائی اصطلاحات کا باضابطہ اور بامعنی استعمال ان کی شاعری میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کے تمام تر رنگ موجود ہیں۔ ان کی غزلوں، نظموں اور رباعیات میں دیگر موضوعات کے ساتھ رومانیت کا پہلو کافی نمایاں نظر آتا ہے۔ انہیں ہندوستان کے معتبر اعزاز پدم بھوشن سے بھی نوازا گیا۔ ان کی مشہور کتاب ''گل نغمہ'' کے لئے ہندوستان کا سب سے اعلیٰ ادبی اعزاز 'گیان پیٹھ' انعام سے انھیں سرفراز کیا گیا۔ (یہ اردو کا پہلا گیان پیٹھ انعام ہے۔)

فراق کے ایک درجن سے زیادہ مجموعے اور خاص کر اردو تنقید اور نثر نگاری کے حوالے سے بھی نصف درجن سے زائد کتابیں شائع ہوئیں۔ ان کی شاعری کا بہت بڑا حصہ اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں منتقل ہو کر ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی شائع ہوا۔ فراق گورکھپوری انگریزی ادب پر بھی بزردست دسترس رکھتے تھے۔ انگریزی ادب و ثقافت پر ان کی چار کتابیں اس بات کا ثبوت ہیں۔ ان کی مشہور کتابیں، ''گل نغمہ''، ''گل رعنا''، ''مشعل''، ''روح کائنات''، ''روپ (رباعی کا مجموعہ) شبستان''، ''سرغم''، ''بزم زندگی رنگ شاعری'' ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے لئے پدم بھوشن، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، اور غالب ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ ادارہ 'نیا دور' کی جانب سے فراق گورکھپوری کے ۱۲۲ ویں یوم ولادت کے موقع پر ان کا منتخب کلام پیش ہے۔

نظم آزادی

مری صدا ہے گل شمع شام آزادی
سنا رہا ہوں دلوں کو پیام آزادی

لہو وطن کے شہیدوں کا رنگ لایا ہے
اچھل رہا ہے زمانے میں نام آزادی

مجھے بقا کی ضرورت نہیں کہ فانی ہوں
مری فنا سے ہے پیدا دوام آزادی

فضا میں جلتے دلوں سے دھواں سا اٹھتا ہے
ارے یہ صبح غلامی یہ شام آزادی

یہ مہر و ماہ یہ تارے یہ بام ہفت افلاک
بہت بلند ہے ان سے مقام آزادی

فضائے شام و سحر میں شفق جھلکتی ہے
کہ جام میں ہے مئے لالہ فام آزادی

دلوں میں اہل زمیں کے ہے نیو اس کی مگر
قصور خلد سے اونچا ہے بام آزادی

وہاں بھی خاک نشینوں نے جھنڈے گاڑ دیئے
ملا نہ اہل دول کو مقام آزادی

ہمارے زور سے زنجیر تیرگی ٹوٹی
ہمارا سوز ہے ماہ تمام آزادی

ترنم سحری دے رہا ہے جو چھپ کر
حریف صبح وطن ہے یہ شام آزادی

ہمارے سینے میں شعلے بھڑک رہے ہیں فراقؔ
ہماری سانس سے روشن ہے نام آزادی

غزل

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں

مری نظریں بھی ایسے قاتلوں کا جان و ایماں ہیں
نگاہیں ملتے ہی جو جان اور ایمان لیتے ہیں

نگاہ بادہ گوں یوں تو تری باتوں کا کیا کہنا
تری ہر بات لیکن احتیاطاً چھان لیتے ہیں

طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

حیات عشق کا اک اک نفس جام شہادت ہے
وہ جان ناز برداراں کوئی آسان لیتے ہیں

ہم آہنگی میں بھی اک چاشنی ہے اختلافوں کی
مری باتیں بعنوان دگر وہ مان لیتے ہیں

جسے صورت بتاتے ہیں پتہ دیتی ہے سیرت کا
عبارت دیکھ کر جس طرح معنی جان لیتے ہیں

تجھے گھاٹا نہ ہونے دیں گے کاروبار الفت میں
ہم اپنے سر ترا اے دوست ہر احسان لیتے ہیں

رفیق زندگی تھی اب انیس وقت آخر ہے
ترا اے موت ہم یہ دوسرا احسان لیتے ہیں

زمانہ واردات قلب سننے کو ترستا ہے
اسی سے تو سر آنکھوں پر مرا دیوان لیتے ہیں

فراقؔ اکثر بدل کر بھیس ملتا ہے کوئی کافر
کبھی ہم جان لیتے ہیں کبھی پہچان لیتے ہیں

...بقیہ ص ۴۳ کا

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

اسی طرح شب کو دُلہن بنا کر اسے محبوب کی یاد کا تحفہ دینا یا دِلوانا نفیسؔ دسنوی جیسے شاعر کا ہی کمال کا تخیل ہوسکتا ہے، کیونکہ وہ فرماتے ہیں:

عروس شب کو کرو پیش اِک حسیں تحفہ
کسی کی یاد کا تازہ گلاب لے آؤ

کبھی شاعر ماحول کو اپنے موافق ڈھالنے کے بعد اسکا بیان کرکے ہی تشفی پا لیا کرتا ہے۔ مثلاً کیفیؔ اعظمی کا یہ شعر اسی امر کا جواز فراہم کرتا ہے۔

وہ مجھ کو بھول گئی اس کی شکایت کیا ہے
رنج تو یہ ہے کہ رو رو کے بھلایا ہوگا

غالبؔ کا عاشق تو محبت میں نامساعد حالات سے مفاہمت کر لیتا ہے اور اسی سے مخاطب ہوکر یوں کہتا ہے۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

اس کے عین برعکس مرزا داغؔ کا عاشق حسد کے مارے گویا مرا ہی جا رہا ہے، ورنہ ایسی بات وہ کبھی بھی اپنے منھ سے نہ نِکالتا:

تمہیں چاہوں، تمہارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں
میرا دل پھیر دو، مجھ سے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا

ٹھیک یہی تخیل موت کے بارے میں الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے شاعر ظاہر کیا کرتے ہیں۔ مثلاً بے شمار شعرا کے استاد شاعر سیمابؔ اکبرابادی نے مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے یہ فرمایا تھا:

ڈرتا ہوں تڑپ کے لحد کو اُلٹ نہ دے
ہاتھوں سے دل دبائے ہوئے ہوں مزار میں

ناسخؔ کا بھی بہت ہی پیارا شعر ملاحظہ کریں۔

دے دوپٹہ تو اپنا ململ کا
ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

اسی طرح سے خیالؔ رامپوری محبوب کے حسن کی مدح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

حسن ہر رنگ میں ہے حسن وہ برہم ہی سہی
پھول کانٹوں میں بھی ہوگا تو مہکتا ہوگا

منور رانا طنزیہ لہجے میں لوگوں کی جانب تیر پھینکتے ہوئے کہتے ہیں:

یہاں تو جو بھی ہے آبِ رواں کا عاشق ہے
کسی نے خشک ندی کی طرف نہیں دیکھا

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ اپنی محبوبہ کے ساتھ تعلقات نا استوار یا ناسازگار ہونے کی صورت میں بھی اسکے حسن کو مزید دو بالا محسوس کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اتنے بگڑے ہیں وہ مجھ سے کہ اگر نام ان کے
خط بھی لکھتا ہوں تو حرف بگڑ جاتے ہیں

امیرؔ مینائی اپنے معشوق کی شرارتی جبلت پر فقرہ کستے ہوئے کہتے ہیں۔

ملنے کا وعدہ انکے منھ سے نکل گیا
پوچھی جگہ جو میں نے تو بولے کہ خواب میں

ایک نامعلوم شاعر کے اس شعر سے توارد کے مدنظر غور وخوض کیجئے:

کیا ملنے کا وعدہ انہوں نے پانچویں دن کا
کسی سے سن لیا ہوگا، زندگانی چار دن کی ہے

کئی بار عاشق کی ذہانی سیرت کے زیر اثر معشوق کی فطرت بھی جذباتی ہو جایا کرتی ہے مثلاً آرزوؔ لکھنوی اسی ضمن میں یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

میرے غم نے ہوش انکے کھو دیئے
وہ سمجھاتے سمجھاتے خود رو دیئے

جلیلؔ مانکپوری کے اس پرانے شعر سے موازنہ کریں:

وقت خوش خوش کاٹنے کا مشورہ دیتے ہوئے
رو پڑا وہ آپ مجھ کو حوصلہ دیتے ہوئے

مندرجہ بالا شاعر آرزوؔ لکھنوی کے پوتے ضمیرؔ کاظمی کٹک سے شائع ہونے والے جریدہ 'ادبی محاذ' کے معاون مدیر ہیں۔ انکا عاشق کسی ایک محبوب کے ساتھ گزارے اپنے یادگاری لمحات کے ہی زیر اثر فرماتا ہے:

آئے گئے سکھ دکھ کے موسم لیکن کس کو ہوش رہا
پلکوں پلکوں بسنے والے سارے خواب نشیلے تھے

۴۔ کسی حقیقی داستان، واقعہ یا حادثے وغیرہ پر مبنی اشعار

اردو شاعری کی تاریخ میں ایسے اشعار کا بھی فقدان نہیں ہے، جو کہ اکثر اس فانی حیات میں کسی دور اندیش شاعر کے قلم کی بدولت منصۂ شہود پر قرطاس پر اس طرح سے رقم ہوتے رہے ہیں کہ وہ ایک لافانی حیثیت پا جاتے رہے ہیں۔ مثلاً لیلیٰ اور مجنوں کے قومی قصے میں ان دونوں کے اسکول میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے ایک بار انکے استاد صاحب نے مجنوں کی ہتھیلی پر بید کی ایک چھڑی سے جیسے ہی ایک ضرب لگائی، ویسے ہی اس کے پاس بیٹھی ہوئی اسکی ہم جماعت لیلیٰ کی ہتھیلی پر اس ضرب کے نشان اس طرح سے نمایاں ہو گئے کہ انکے استاد کی آنکھیں کھلی کی کھلی ہی رہ گئی تھیں۔ اسی عوامی قصے کی بِنا پر قتیلؔ شِفائی صاحب نے یہ شعر کہا تھا۔

یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے
کہ سنگ تجھ پہ گرے اور زخم آئے مجھے

قتیلؔ صاحب نے ہی اپنی محبوب اور اپنے وقت کی مشہور گلوکارہ اقبال بانو کے جوڑے کو باندھنے کے خاص اسٹائل سے متاثر ہوکر یہ شعر رقم کر ڈالا تھا:

تو نے یہ پھول جو جوڑے میں سجا رکھا ہے
اِک دیا ہے جو اندھیروں میں جلا رکھا ہے

کہا جا سکتا ہے کہ کسی ادیب یا شاعر وغیرہ کی سوانح حیات مرتب کرتے وقت اسی نوعیت کے ذاتی حوالے محققوں کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوا کرتے ہیں۔ قتیلؔ کے اپنے ہی فرزند نے انکے عشق معاشقوں

کی تصدیق اپنے خطوط میں جا بجا کی تھی۔

ایک دیگر عوامی قصہ مروجہ رہا ہے کہ ایک بار بادشاہ جہانگیر اپنی محبوبہ نور جہاں کے ساتھ اپنے محل کے بام پر ایستادہ تھے اور انہوں نے اسے دو کبوتر تھما دیے تھے، تبھی نیچے سے کسی کے بلانے پر انہیں جانا پڑا تھا، جب چند لمحات کے بعد وہ واپس آئے، تب انہوں نے نور جہاں کے ہاتھ میں فقط ایک ہی کبوتر دیکھا اور استعجاب سے دریافت کیا کہ 'دوسرے کبوتر کا کیا ہوا؟' تب معصوم فطرت نور جہاں نے کہا کہ 'وہ تو اُڑ گیا۔'' اس پر بادشاہ سلامت نے پوچھا۔ ''وہ کیسے؟'' تب بموجب معصومیت انکی جان جاں نے اپنے ہاتھ سے دوسرے کبوتر کو بھی ہوا میں اڑاتے ہوئے کہا۔ ''ایسے۔''

بس اسی عوامی واقعہ کی بنیاد پر قیس اعجاز کے قلم نے اس شعر کی تخلیق کر دی تھی:

بتایا اُس نے کہ پہلا پرندہ ایسے اُڑا
اُڑایا ہاتھ سے تھا دوسرا کبوتر جب

اسی طرح ایک قدیم شاعر جناب عباس بیگ احساس بریلوی کے اس ایک شعر کو اپنی حکومت کے خلاف بغاوت کا مظہر جان کر انگریز حکمران نے ان کے پھانسی دے ڈالی تھی:

اخترؔ جھک گئے ترے خالوں کے سامنے
گوروں کے پاؤں اٹھ گئے کالوں کے سامنے

یہاں مبالغہ آرائی کی ہی صنعتِ شاعری کا استعمال کیا گیا تھا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہی ہے کہ مہاتما گاندھی جی کے قتل کے بعد مجازؔ لکھنوی صاحب نے یہ دردآمیز شعر کہا تھا۔

ہندو چلا گیا نہ مسلماں چلا گیا
انسان کی تلاش میں انساں چلا گیا

انگریزی زبان میں سائنسدان چالس ڈارون کا نام ''تھیوری آف ایوولیشن' کے اختراع کے موجب شہرۂ آفاق رہا ہے۔ اس کے بموجب اس دنیا میں بیشتر اشیاء کی نمود اور وسعت بتدریج ہی ہوا کرتی ہے اور اس ترقی میں فقط وہی اشیاء باقی بچی رہتی ہیں، جو کہ دوسری اشیاء کے مقابلے میں قدرے طاقتور ہوا کرتی ہیں، بقیہ ہمیشہ زوال پذیر ہی ہو جایا کرتی ہیں۔ survival of the fittest نام کے اسی سائنسی اصول کی بنیاد پر محشرؔ بدایونی کا یہ شعر اردو شاعری میں سائنس کے کافی عمل دخل کا بھی ایک ضامن ثابت ہوتا ہے:۔

اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ
جس دئے میں جان ہوگی، وہ دیا رہ جائے گا

اسکے عین بموجب کسی شعر کو سائنس کا بھی مرہونِ منت تصور کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً عصرِ حاضر کے شاعر مظفرؔ حنفی کا یہ ایک شعر ملحوظِ خاطر ہے:

خود پر کچھ اعتراض بھی برداشت کیجئے
کانٹے نکالنے سے کلی سوکھ جائے گی

اسی طرح متعدد شعرا نے ہر ایک شخص کو زندگی میں خود احتسابی اور اپنی تنقید سے بھی استفادہ کرتے رہنے کا کارآمد سبق فراہم کیا ہے۔ ہندی کوی رحیم نے بھی اپنے ایک دوہے میں یہی تجویز کی تھی کہ ہمیں اپنے کسی ''ناقد کو اپنے آنگن میں کُٹی بنا کر ہمیشہ اپنے قریب تر رکھنا چاہیئے، کیونکہ وہ 'بِن پانی سابن بِنا نرمل کرے سُبھائے' کی حیثیت رکھتا ہے یعنی ایک ناقد ہماری فطرت کو ہمیشہ صاف وشفاف کر دیا کرتا ہے۔

خود احتسابی کی تلقین کرنے والا ثمارؔ بارہ بنکوی کا یہ شعر بہت مقبولِ عام ہوا ہے:

دوسروں پر اگر تبصرہ کیجئے
سامنے آئینہ رکھ لیا کیجئے

اسی طرح قدرتی مناظر کے مشاہدات بسا اوقات ہمارے رو برو حیران کُن واقعات پیش کیا کرتے ہیں۔ مثلاً آگے چل کر ظفرؔ گورکھ پوری سے یہ شعر بھی اخذ ہوا ہے:۔

ارادہ ہو اٹل تو معجزہ ایسا بھی ہوتا ہے
دئے کو زندہ رکھتی ہے ہوا، ایسا بھی ہوتا ہے

اسی نوعیت سے حیات کے ہی حقیقی مشاہدات کو بھی بعض اوقات کسی گزری ہوئی داستان کی ہی مانند کسی خاص شعر کی شریانوں میں جذب وحلول محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار اسی ہیت کے زمرے میں رکھے جانے کے مستحق ہیں۔

جب ہندوستان سے متوسط طبقے کے نوجوان اپنے والدین کی خون پسینے کی کمائی خرچ کر کے بیرونی ممالک میں اور زیادہ دولت کمانے کی بے جا ہوس میں چلے جاتے ہیں، تب وہاں پر ٹھیک سے مقیم بھی نہ ہونے کے درد کو جب تب اپنے والدین کو مطلع ضرور کرتے رہتے ہیں۔ منور رانا کو ماں سے متعلق اشعار سے خاص مقبولیت نصیب ہوئی تھی۔ یہ ایک شعر بھی ایک ماں کے داخلی درد کو اسی کے فرزند کے اعتراف کے توسط سے مختصراً یوں بیان کرتا ہوا ایک نہفتہ سبق بھی فراہم کرتا ہے:۔

برباد کر دیا ہمیں پردیس نے مگر
ماں سب سے کہہ رہی ہے کہ ''بیٹا مزے میں ہے

راشد انور راشدؔ نے اس شعر میں ایک ماں کی مامتا کے توسط سے فرزند کی عمر تک کو بھی بالائے تاک رکھ دیا ہے اور شعر کو یوں بُنا ہے:

میں بوڑھا ہو چلا ہوں، پھر بھی ماں تاکید کرتی ہے
میرے بیٹے نہ جانا گھر سے شام ہوتے ہی

حوم جانثار اخترؔ صاحب کے اس شعر کی بہت تعریف وپذیرائی ہوئی ہے:۔

سستے داموں لے تو آتے، لیکن دل تھا بھر آیا
جانے کس کا نام کھُدا تھا پیتل کے گُلدانوں پر

۵۔ خودی، خود اعتمادی و امید پرستی کے جذبوں کی عکاسی:

'کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور' کے علاوہ بھی انکے قولوں میں انانیت کا وہی جذبہ دستیاب ہوتا رہتا ہے جس کے بارے میں انگریزی ناول نگارہ جین آسٹین نے اپنے شہرۂ آفاق ناول پرائڈ اینڈ

پریجوڈس' میں اس ناول کے ازحد مغرور ہیرو کی انانیت کی بابت اس جاندار ناول کے موضوع کو فقط اس ایک فقرے میں مختصرائیوں مقید کر کے رکھ دیا ہے۔

Where there is a real superiority of mind, pride will be always under good regulation.

مفہوم یہ ہے کہ جہاں واقعی دل و دماغ کی اصل بلندگی یا برتری ہوتی ہے، وہاں انا ہمیشہ صحیح پیرائے میں ہی چلا کرتی ہے۔'' انا کا ہی دیگر نام 'خودی' کہا جا سکتا ہے۔ ایسی خودی رکھنے والے اشخاص عموماً سخت مزاجوں کے حامل ہوا کرتے ہیں۔ شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ نے بھی اپنے اس خاص شعر میں ایسے اشخاص کے انفرادی تشخص کی بابت یہ نفسیاتی شعر قلم بند کیا تھا:۔

آسماں سخت مزاجوں کو ہنر دیتا ہے
دیکھ لو ہوتے ہیں فولاد میں جوہر پیدا

منور رانا نے بھی جنگل کے بادشاہ مانے جانے والے شیر کے بہانے سے ہی ایسے انا پرست آدمیوں کی بابت یہ ایک نفسیاتی شعر رقم کیا تھا:۔

بوڑھے ہونے پر بھی شیر کی غراہٹ نہیں جاتی
میں لہجہ نرم کر بھی لوں تو جھنجھلاہٹ نہیں جاتی

یہ ایک شعر فقط یادداشت سے ہی درج کیا ہے اور ایک دو الفاظ کی تبدیلی بھی ممکن ہے۔

اسی جذبے سے مشابہت رکھنے والا جذبہ خود اعتمادی کا بھی ہوتا ہے۔ ہندی اور اردو کے فلمی سے زیادہ ادبی شاعر شیلیندر نے کسی نغمے میں درج کیا تھا:

زندہ ہے تو زندگی کی جیت میں یقین کر
اگر نہیں ہے سورگ تو اُتار لا زمین پر

شادؔ عارفی کا یہ شعر بھی اسی قبیل کا ہے:

چومتے آتے ہیں ہم نقشِ قدم
وہ سمجھتے ہیں کہ پیچھے رہ گئے

تاجدار تاجؔ کا ایک شعر ہے:

تیرے محل میں جھک کر آنا غیرت کو منظور نہیں
اپنے قد سے نیچے دیکھی ہم نے ہر محراب یہاں

علی سردار جعفری نے بھی اس شعر میں ایک نصیحت آموز سبق کو ہی دینے کی سعی کی ہے:

ہوتی ہے زمانے میں کس طرح پذیرائی
نکلو تو ذرا گھر سے اِک ذوقِ سفر لے کر

اسی شاعر کی حیات کا سب سے اول کہا ہوا یہ شعر ہی بتایا جاتا ہے:

دامن جھٹک کے منزلِ غم سے گزر گیا
مُڑ مُڑ کے دیکھتی رہی گردِ سفر مجھے

اسی طرح منور رانا نے بھی اپنے اس شعر کے تحت خود اعتمادی کا عروج ہی آشکار کیا ہے۔

کسی کے پاس آتے ہیں تو دریا سوکھ جاتے ہیں
کسی کی ایڑیوں سے ریت میں چشمہ نکلتا ہے

اخترؔ گوالیاری کا شعر ہے:۔

اب اس مقام پر میرا چراغ جلتا ہے
جہاں پہنچ کر ہواؤں کا دم نکلتا ہے

اسی ضمن میں محشرؔ بدایونی صاحب کے استعاراتی زبان میں درج امید پرستی کے اسی جذبے سے لبریز قابلِ غور و خوض یہ ایک شعر بھی ہے:

وہ ایک رات چراغاں ہوا زمانے میں
ہوا بھی ہو گئی شامل دیے جلانے میں

پروفیسر شہپر رسول کا یہ شعر اسی زمرے میں رکھے جانے کا درخور ہے:

اس نے سیلاب کی تصویر بنا بھیجی تھی
اسی کاغذ سے مگر ناؤ بنا دی میں نے

شکیبؔ جلالی صاحب کے اس شعر میں تو قدرتی مشاہدے کا عروج ہی مانا جا سکتا ہے۔

مجھ کو گرنا ہے، تو میں اپنے ہی قدموں میں گروں
جس طرح سایۂ دیوار پہ دیوار گرے

۲۔اسلوب کا زاویہ

ا۔اسلوب تضاد

راقم الحروف نے اپنے مطالعے کی بنا پر اردو شاعری کے وسیع مطالعے سے وابستہ اسلوب کی سطح پر متضاد مثالوں کی افراط کے مدنظر 'اسلوبِ تضاد' نام سے ایک نئے اسلوب کا اختراع کرنے کی سعی کی ہے۔ مرزا غالبؔ سے لے کر تا حال ہم عصری متعدد شعرا نے دانستہ یا نادانستہ اسی ہیئت میں ہزار ہا اشعار کی وقتاً فوقتاً تخلیق کی ہے۔ اب یہاں بھی چند مثالوں کو پیش کیا جا رہا ہے:۔

بھاگ رہا ہے دریا بھی ساگر کی طرف
پیاس بجھانے والا خود پیاسا نکلا

(سجاد باقر رضوی)

منظورؔ ہاشمی صاحب نے ظالموں کی فِطرت کو اس طرح سے برہنہ کرنے کی سعی فرمائی:

ہدف بھی مجھ کو بنایا ہے اور میرے حریف
مجھی سے تیر، مجھی سے کمان مانگتے ہیں

۲۔طنز میں تخیل

آزادی کے بعد جس طرح سے لوگوں کے خواب چکنا چور ہوئے، وہ اپنے آپ میں ایک طویل داستان کا موضوع ہو سکتا ہے۔ ضمیرؔ کاظمی صاحب کا ہی یہ ایک شعر قدامت پرست روایتی اور جدید نظریات کے مابین مابہ الامتیاز گردانا جا سکتا ہے:

کچھ لوگ بڑھ کے چاند ستاروں سے مل گئے
اور میں ابھی تک اپنے مقدر کے ساتھ ہوں

فرسودہ و فضول روایت کے نام پر
اپنے تمام دوست وفا کے خِلاف ہیں

ابراہیم اشکؔ مغربی تہذیب کو آڑے ہاتھ لیتے ہوئے فرما رہے ہیں:

'اشک' تہذیب وہ بچائیں گے
کب سے جو بے لباس بیٹھے ہیں

علامہ اقبال نے بھی مغربی تہذیب پر طنز کرتے ہوئے یہ نشتر چلانے میں مطلق گریز نہیں کیا تھا:۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیاں بنے گا نا پائدار ہوگا

بہرائچ کے ڈاکٹر قمر رئیس کہتے ہیں

مفلسی نے مری وہ جال بچھایا ہے قمرؔ
اب مری چھت پر پرندے نہیں آنے والے

اسی نوعیت کا ایک اور شعر انکا ہی ہے۔

مفلسی شہر پر اس درجہ ہوئی ہے حاوی
اب پرندے کسی چھت پر نہیں دیکھے جاتے

انگریز سرکار کے ظلم و تشدّد پر بھی یہ شعر استہزایہ لہجے میں مانا جاسکتا ہے:

صیاد نے پہلے تو رہائی کی خبر دی
پھر ڈال دئے اس نے مرے پَر مرے آگے

یہاں لوگوں کے دوہرے کردار پر بھی ایک سخت کاری ضرب کرتے ہوئے شمیمؔ طارق کہتے ہیں:

بہادری کے جو قصے سنا رہا ہے بہت
مسافر جنگ سے بھاگا ہوا ہے

خمارؔ بارہ بنکوی کا ایک پرانہ مزاحیہ بھی شعر آجکل کی نام نہاد دوستی پر گلال پھینکنے والا ہے۔

الٰہی میرے دوست خیریت سے ہوں
کیوں گھر میں پتھر نہیں آ رہے ہیں

سیّد رحمانی کے اس شعر سے بھی بموجب مفہوم سیر حاصل موازنہ کریں۔

مرے عقب میں مرے دوست ہیں سبھی لیکن
پریشاں ہوں کہ یہ پتھر کدھر سے آتے ہیں

اردو شاعری میں زاہد اور محتسب وغیرہ کو جا بجا ہدف بنایا جاتا رہا ہے اور اس کے مقابل ایک شرابی کو ترجیح دیتے ہوئے میخوار کے ذریعے اس پر طنزیہ جملے بھی کسنے کی خاصی روایت رہی ہے۔ سائلؔ دہلوی کا یہ شعر ایک مذہبی شخص کو میخانے پہنچا کر یہ اس سے کیسا کام لیتے دِکھاتا ہے۔

محتسب تسبیح کے دانوں پر یہ گنتا رہا
کس نے پی کس نے نہ پی کس کس کے آگے جام تھا

شہروں کی خودغرضی سے لبالب تہذیب کو بشیر بدرؔ اور ندا فاضلی جیسے کئی شعرا نے نشانہ بنا کر ترش اشعار کہے ہیں مثلاً بقول بشیر بدر:

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

ان کا یہ شعر بھی مشہور ہے:

'محبت میں دکھاوے کی دوستی نہ دکھا
جو گلے نہیں ملتا تو ہاتھ بھی نہ ملا

اور ندا فاضلی کے ایک شعر کا یہ ایک مصرع بھی برِصغیر میں قبولِ عام رہا ہے۔

'دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہئے'

شہری زندگی کی بہ نسبت دیہاتی حیات کی برتری و بہتری کی بابت متعدد شعرا نے اشعار بنائے ہیں۔ من جملہ فقط منور رانا کے دو شعر ملحوظِ خاطر ہیں۔

تمہارے شہر میں میت کو سب کاندھا نہیں دیتے
ہمارے گاؤں میں چھپّر بھی سب مل کر اٹھاتے ہیں

اب سید نفیسؔ دسنوی کے اس شعر سے موازنہ کیجئے۔

اب کوئی شخص کہاں کھل کر ملا کرتا ہے
آپ رسماً ہی سہی ہاتھ ملاتے رہئے

آج رہبر و رہزن کی اِصطلاح کے یکساں ہو جانے کی المناکی کیفیت کا بیاں قابلِ مدح ہی جائے گا۔

مسافر کو جو خود ہی لوٹ لیتا ہے نفیسؔ اکثر
زمانہ پھر اسی رہزن کو کیوں رہبر بناتا ہے

مزید ایک اور شعر اِسی ضمن میں لائقِ غور و خوض پیشِ خدمت ہے۔

کارواں کا لٹ جانا کس قدر یقینی ہے
ساتھ اسکے راہزن ہیں، کب ہے رہبر تنہا

راجیش ریڈی نے آج کے زمانے میں امن و امان کی غیر موجودگی کے لا اِنتہا درد کو غالبانہ انداز میں یوں بیان کیا ہے

جس جگہ غالبؔ نے چاہا تھا کبھی چل کر رہیں
کیا سلامت ہے زمیں پر اب کوئی ایسی جگہ

دنیا میں غربت اور امیری میں بالعموم عزت کے معاملے میں موجودگی اور غیر موجودگی ایک ساتھ ملا کرتی ہے۔ تبھی امیر انصاری اس زمینی حقیقت کا معقول جواز پیش کرنے والا یہ شعر کہتے یوں نظر آتے ہیں۔

غربت تھی تو فاقوں میں بھی پردہ نہیں چھوڑا
دولت نے مگر سر پہ دوپٹہ نہیں چھوڑا

اِدھر ہم عصری شاعر جمیل احمد جمیلؔ بھی کہہ رہے ہیں۔

معترض کی سند پانا ہے تو مرنا ضروری ہے
زمانہ زندہ لوگوں کو کہاں اعزاز دیتا ہے

ایک معشوق اپنے عاشق کو اپنے ساتھ ملاقات کا زریں موقعہ شاذ و نادر ہی دیا کرتا ہے اور دیتا بھی ہے تو اس طرح کہ اسکا دینا نہ دینا یکساں رائیگاں ہی ثابت ہوا کرتا ہے۔ مثلاً راجیش ریڈی کا شعر کہتا ہے۔

تو پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے، آئے جو خواب میں

آج کا انسان زمین پر اپنی ترقی کی لا متناہی منزلیں طے کرنے کے بعد گزشتہ صدی سے جس خود اعتمادی سے سائنس کی بیساکھیاں تھام کر چاند و دیگر سیاروں پر اپنے قدم ثبت کرنے کے مقصد سے متواتر کوشاں ہے، اسے دیکھ کر توازن بگڑ جانے کا جو خدشہ رات دِن دل دِماغ پر طاری رہا کرتا ہے، اسی کے مدِّنظر شعرا نے اپنے تخیل کے بل بوتے پر اسے روکنے کی سعی کی ہے، مثلاً جمیل مظہری کا اِنسان کے بارے میں یہ نتیجہ اخذ کرنا مناسب ہی معلوم ہوتا ہے کہ۔

آسماں کی تو ہمسری کر لی
خاک زادہ تھا، خاک ہی میں ملا

مظہرؔ صدیقی نے اپنی غزلوں میں دورِ حاضر کی ایسی ہی بے ترتیبی، بدعنوانی، آتشزنی، کہرام، تگ و دو، مکانوں، عمارتوں وغیرہ کی حد درجہ کی کمی و تنگی بالخصوص انکے ہی تعمیر کردہ مزدور طبقہ لوگوں کے واسطے رہنے بسنے کا مسئلہ درپیش ہوتے رہنا، شہروں میں حاکموں کے آنے جانے سے غریبوں پر آئے دن آفتوں کا نازِل

ہونا عوام کے لیے تو جیسے اب یہ روز مرّہ کا ہی ایک معمول ہو کر رہ گیا ہے۔ اِن کے کچھ اشعار قابلِ داد و تحسین قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

کیا شرپسند قید سے آزاد ہو گیا
جو آج سارا شہر سر شام بند ہے

معمار فلک بوس عمارات کے ہیں مضطر
اور خود کو کِرائے کا مکاں تک نہیں مِلتا

جھونپڑے سب صاف کر دینے کی باری آئے گی
کل ادھر ظلِّ الٰہی کی سواری آئے گی

شاذ تمکنت نے دنیا سے لاجواب امثال کے ساتھ نایاب تشبیہات کا بھی انتخاب کرتے ہوئے ایسے اشعار کی تخلیق کی ہے:

نباہ کرتا ہوں دنیا سے اِس طرح اے شاذؔ
کہ جیسے دوستی ہو آستین و خنجر کی

ڈاکٹر کلیم ضیا نے کہیں تو آجکل کے برائے نام فنکاروں کی بے طرح قلعی کھولی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

اب تو بھلے برے میں کوئی فرق ہی نہیں
فنکار بولتے ہیں، ہنر بولتے نہیں

اور کہیں غالبؔ کی مانند:

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

خود بھی اہلِ کرم کی اہلیت پر سوالیہ نِشان جڑتے نظر آتے ہیں:

کشکول لیے پوچھ رہا ہے کوئی مجبور
بستی میں کوئی اہلِ کرم ہے کہ نہیں

ڈاکٹر کلیم ضیا نے عصر حاضر کے ماحول کے مدنظر بہترین تشبیہ کا استعمال کیا ہے:

آج پھر ماچس کی ڈبیا سازشوں کی زد میں ہے
کانا پھوسی چل رہی ہے تیلیوں کے درمیاں

دُنیا کے مسئلوں کے حل کے بارے میں جاں نثار اخترؔ ایک بارگی تو قاری وغیرہ کو سیراب کر دیتے ہیں لیکن دوسرے ہی لمحے اسکے پاؤں تلے سے زمین سرکانے کے نقطۂ عروج والے انداز میں اس طرح کے شعر کی تشکیل کرتے نظر آتے ہیں:

ہم نے دنیا کے ہر اِک درد کا حل ڈھونڈھ لیا
کیا برا ہے جو یہ افواہ اُڑا دی جائے

پروفیسر وسیمؔ بریلوی صاحب کا حیات و اسکے مشاہدات کے متعلق ایک وسیع نظریہ رہا ہے، اس لیے انکے قلم سے بہت ہی کلاسیکی انداز کی عمیق حقیقتیں نِکلا کرتی ہیں۔ مثلاً حیات کی یہ اصطلاح کو قابل ستائش ہی کہا جائے گا:

جو مجھ میں تجھ میں چلا آرہا ہے برسوں سے
کہیں حیات اسی فاصلے کا نام نہ ہو

شجاع خاور ایک شعر میں مہاتما گاندھی کی عدم تشدد (اہنسا) والی پالیسی سے متفق ہوتے ہوئے بھی ستم کی بھی گردن زنی تک کا سفر طے کر جاتے ہیں:۔

ستم کو دیکھتے رہنا ستم سے کم نہیں ہوتا
یہ دعویٰ ہے مرا، قاتل گواہوں میں بھی ملتے ہیں

اسی طرح وحید اخترؔ آجکل کی بات کرتے ہوئے بھی گویا انگریزوں کے ظلم و تشدد کی یاد کرا دیتے ہیں۔

گھر بھی جلا لہو بھی بہا، پھر یہ حکم ہے
فریاد مت کرو، یہ کوئی حادثہ ہوا

پروین فنؔا غیروں کے ہی شریک محفل ہونے کے موجب انہیں خطاوار ٹھہراتے ہوئے یہ خیال فرماتی ہیں۔

اب تو شریک محفل اغیار کون ہے
ہم بے وفا ہوئے تو خطا وار کون ہے

اسی طرح کے بے شمار اشعار طنز کے زاویے سے بھی تخیل کے سرسبز عِلاقے میں اپنی روشنی سے اردو شاعری کی فضا کو معطر اور خوشگوار کرتے دستیاب ہوتے رہتے ہیں۔

۳۔ مزاح میں تخیل

طنز کی طرح سے پرمغز و مزاحیہ مظامین میں بھی شعراء کے طائر تخیل نے مختلف جہتوں میں اپنی پروازوں کے زاویے درج کرائے ہیں۔ علامہ اقبال کے لیے ایک بار ان کے دوست اکبر الہ آبادی نے تحفے میں چند عدد لنگڑا آم ارسال کئے تھے، جن کو دیکھ کر وہ ازحد خوش ہوئے اور انہوں نے فوراً وصولیابی کی رسید ارسال کرتے ہوئے یہ ایک شعر بھی فی البدیہہ لکھ کر چٹ کے ساتھ ٹانک دیا تھا، جس میں انکے تخیل کا ایک مستحکم ثبوت ملتا ہے:

تیرے فیض مسیحائی کا ہے یہ سب اثر اکبرؔ
الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا

قرآن میں شراب پینا حرام ہونے پر بھی اردو شاعری میں شاعروں نے زاہد و پارسا کی بار بار ان کے شراب نہ پینے پر خاصی مذمت کی ہے اور بسا اوقات انکے منافق کردار کو طنز و مزاح کا حذف بنانے میں کوئی بھی کسر نہیں رکھی ہے۔ پنڈت لبھو رام جوشؔ ملسیانی کا یہ ایک شعر ہی بطور سند پیش کیا جاسکتا ہے۔

جام لے کر کہا یہ زاہد نے
دیکھنا کوئی دیکھتا تو نہیں

دوسرے پیرائے میں بھی مزاحیہ اشعار کہنے والوں کی پرواز تخیل کی بلندیاں قابلِ دید و داد ہی رہی ہیں۔ اقبال ساجد کا یہ شعر اسی امر کی شہادت پیش کرتا ہے۔

اُٹھا لیتا ہے اپنی ایڑیاں جب ساتھ چلتا ہے
وہ بونا کس قدر میرے قد و قامت سے جلتا ہے

اسی طرح راجیند رناتھ رہبرؔ (پٹھان کوٹی) کا یہ نصیحت آموز شعر سبق لینے کی بجائے قاری کو الٹے قہقہہ لگانے پر بھی مجبور کر سکتا ہے۔

جل کی ہر بوند قیمتی ہے یہاں
ایک دِن چھوڑ کر نہایا کر

یہ شعر ایک عام سے مشاہدے کا شاہد مانا

جائے گا۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں تخیل کم اور ایک عام سے تجربہ کی حقیقت بیانی کا مزا ہی دیتا ہوا مزاح کے رس تک ہماری دسترس کیے دے رہا ہے۔

ایک شاعر سے آج میں نے کہا
بن کہے شعر مت سنایا کرو

قیصرؔ دہلوی کا یہ شعر بھی خاصا مزاحیہ ہونے کے ساتھ مزید تخیلی بھی مانا جاسکتا ہے۔

بوتل کھلی جو حضرتِ زاہد کے واسطے
مارے خوشی کے کاگ بھی دو گز اچھل گیا

منشی دوارکا پرشاد افقؔ لکھنوی کا یہ شعر بھی ملحوظِ خاطر ہے :۔

کمر یار کے گم ہونے کا ہر سو غل ہے
دیکھو بے نام و نشاں کی ہوئی شہرت کیسی

۴۔قدرتی و مادی استعاروں کے زاویوں سے پیش رفت:

شاعروں کو وہبی یعنی خدا کی دادِ قدرت کہیں تو وہ انہیں بیش قیمت تحفوں سے نوازتی رہتی ہے اور کہیں تمام لوگوں کو بھی اپنی زندگی مسرّت وقناعت سے جینے کے لیے نصیحت آموز سبق دیتی نظر آتی رہتی ہے۔ ان استعاروں سے متعدد زاویوں سے شعرا نے استفادہ کیا ہے۔دنیاوی معائنے اور مشاہدات کی شہادت تو قدیم سے لے کر جدید شاعری میں بدستور دستیاب ملتی رہتی ہے۔سنسکرت زبان کے عالم وفاضل آچاریہ ممّٹ نے شاعری کی ناگزیر شش شرائط میں ایک دنیاوی معائنے کو ہر ایک شاعر کو بلند پایہ شاعری کی تخلیق کے لیے ناگزیر قرار دیتے ہوئے اس شرط کی تکمیل خاص کی تجویز کی تھی ۔اگلے اشعار بطورِ جواز پیش ہیں:

ریل کے زور شور سے سارا مکاں لرز گیا
اوس الگ نہ ہوسکی کھلتی ہوئے گلاب سے

(ظفرؔ اقبال)

علامہ اقبالؔ نے ہی 'خودی' کے جذبے کیا ظہار کے مقصد سے 'شاہین' اور 'عقاب' جیسے پرندوں کو ایک مستحکم ومستقل ذریعہ بنایا تھا۔مثلاً یہ مشہور ومقبول شعر اسی بات کا ضامن ہے:

تو شاہین ہے کام ہے پرواز تیرا
تیرے سامنے آسمان اور بھی ہیں

یا اشتراکی سیاست کی پشت پناہی کرنے والے سیاست دانوں نے انکے ہی اس خاص شعر کو اپنی سیاست کے فروغ کرنے اور نچلے طبقے سے منسلک لوگوں کی حوصلہ افزائی کے نصب العین سے اپنا ذریعہ یا اسلحہ بنایا تھا:

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

پھول سے لپٹی ہوئی تتلی کو ہٹا کر دیکھو
آندھیو، تم نے درختوں کو گرایا ہوگا

(کیفؔ بھوپالی)

کانٹوں میں گھر کے پھولوں کو چوم آئے گی شاید
تتلی کے پروں کو کبھی چھلتے نہیں دیکھا

(پروین شاکر)

ضمیرؔ کاظمی کے تخیل کی بھی یہ خاص پرواز قابل تحسین ہے۔

تتلی اداس ہو کے چھپی دیکھتی رہی
پھولوں سے کھیلتا ہوا بھنورا مزے میں ہے

راج نرائن رازؔ کے خیال کی یہ باریک بینی بھی قابل ستائش ہی کہی جائے گی۔

کوئی بھی میرے کرب سے آگاہ نہیں ہے
میں شاخ سے گرتے ہوئے پتے کی صدا ہوں

بلند قدرِ حیات سے گریز کرکے معمولی و عام قدرحیات کو سینے سے لگائے زندگی کرنے والوں پر جگنو وآفتاب کے استعارے سامنے لاتے ہوئے راجیش ریڈی اپنے لاجواب تخیل کا ایک ثبوت اس شعر میں یوں پیش کررہے ہیں:۔

جگنو عزیز ہوں جنہیں سورج سے ہو گریز
اب ان کو روشنی کے معنی بتائے کون

ایک بار ہندی فلموں کے بے مثال اداکار بلراج ساہنی صاحب سے انکی ماتا جی نے اس عجیب سوال کا صحیح جواب دریافت کیا تھا۔''اگر تمہارے سامنے چاولوں کے دو چھوٹے اور بڑے دو ڈھیر رکھے ہوئے ہوں،تو تم بھلا کس ڈھیر میں سے چاولوں کی مٹھی بھرنا چاہوگے؟

کافی لمحے خاموش رہنے پر والدہ نے ہی انہیں ہمیشہ بڑے ڈھیر میں سے ہی کچھ بھی لینے کی مفید نصیحت کی تھی۔انکے کہنے کا مفہوم یہی تھا کہ انسان کو ایک بڑا مقصد رکھ کر ہی ہمیشہ اپنی زندگی جینی چاہئے۔

مندرجہ بالا شاعر بھی صحرا و دریا کو آج کے آدمی کی روزمرہ کی مایوسی وناامیدی کا مظہر بنا کر اپنے تخیل کی ایک پرواز یوں بھرتا نظر آتا ہے:

دن گزرتے ہیں میری راہوں کو صحرا کر کے
راتیں جاتی ہیں میری آنکھوں کو دریا کر کے

عاشق ومعشوقہ کی جوانی وحسن کی وجہ سے ہی انکا عشق پروان چڑھا کرتا ہے اور اسے ناکامی و کامرانی نصیب ہوا کرتی ہے۔آرزوؔ لکھنوی کے اس مشہور ومعروف شعر کا مصرع دوم تو ضرب المثل کی صورت ہی اختیار کرچکا ہے۔

دو تند ہواؤں پر بنیاد ہے طوفان کی
یا تم نہ حسیں ہوتے یا میں نہ جواں ہوتا

مندجہ بالا صحرا و دریا کے مظاہر کے ضمن میں شاعر محبوب سے ملاقات میں حائل ہونے اور معاون ہونے کے طور پر بھی استعمال کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اے دل، میں کراتا تری دریا سے ملاقات
/ حائل جو مِری راہ میں صحرا نہیں ہوتا

(مضطرؔ صدیقی)

زمانے میں باہمی سازشوں کے معائنوں نے شاعروں سے لاجواب اشعار کی بناوٹ و بُناوٹ

کروائی ہے۔مثلاً یہ اشعار ملاحظہ کریں:۔

رشتہ ہوا کا گہرا ہے جنگل کی آگ سے
لیکن نہیں ہے دوستی جلتے چراغ کی۔
(ٹی۔این۔راز)

دشمنوں دشمنوں میں میل ہوا
زہر زہر میں مِل گیا آخر
(محسن زیدی)

جب مِرے گھر میں آگ بھڑکی تھی
ملنے آیا تھا وہ ہوا کی طرح
(عقیل شاداب)

قدرتی مناظِر نے طائر وشجر کے توسط سے بھی لا محدود خیالات کے گل بوٹے کھلائے ہیں۔ پروین شاکر کا شعر ہے:

کل رات جو ایندھن کے لیے کٹ کے گرا ہے
چڑیوں کو بہت پیار تھا اس بوڑھے شجر سے

پرکاش فِکری کا یہ شعر اِنسانی آزادی کی خاطر طائروں کو ہی ذریعہ بناتا ہے۔

اُڑتے پرِندوں کی طرح ہم بھی ہوا میں
ہر شام نئی شاخ کی بانہوں میں اُترتے

ایک مثل ہے کہ دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک کر پیتا ہے۔اسی ضرب المثل کے بموجب تلک راج پارسؔ نے اپنا یہ شعر ڈھالا ہے۔

پچھلے موسم کی آندھی کا خوف ہے ایسا پیڑوں پر
تیز ہوا بھی چل جائے تو پتے شور مچاتے ہیں

شبنم کو غریبوں کا مظہر بنا کر شاعر غنچوں کو بے رحمی کا طوق پہنا دیتا ہے اور دستورِ زمانہ پر طنز کرنے کا موقع نِکال لیتا ہے۔

چمن میں کون ہے پرسان حال شبنم کا
غریب روئی تو غنچوں کو بھی ہنسی آئی

اسی طرح زِندگی کے عام وخاص مشاہدات شعرا کے خامۂ خاص سے انکی باریک بینی سے پُر ایسے اشعار اخذ کرواتے رہتے ہیں:

خود اپنے ہی اندر سے ابھرتا ہے وہ موسم
جو رنگ بچھا دیتا ہے تتلی کے پروں میں
(اطہر نفیس)

زمین و آسماں کے قلابے ملانے والے لوگ شاعری کی زمین پر اتر کر ان دونوں کو مظاہر بنا کر نہ جانے کہاں کہاں کے خیالات پیش کرتے رہے ہیں۔کرشن کمار طور کا ہی یہ شعر ہے:

کچھ ہم بھی کٹے ہیں اب زمیں سے
کچھ وہ بھی آسماں ہوئے ہیں

علامہ اقبال نے تحریک آزادی میں 'شاہین' کو مظہر بنا کر بیش قیمت خیالات کا اظہار کیا تھا۔آزادی کی جنگ میں جستجو کرنے والوں کے ضمن میں چند مندرجہ ذیل امثال لائق غور وفکر اور قابل تحسین ہی کہے جاسکتے ہیں۔

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لیے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

۵۔محاورات کا موزوں استعمال

مولانا حالی نے زمانہ ساز لوگوں کی بے حسی اور بے اعتنائی پر طنز کرنے کے لیے قدرتی اِستعاروں کے ساتھ ہی محاوروں سے بھی کام لیا ہے۔

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

یہاں 'دریا' اگر زمانے یا ان کے بے حس عوام کا مظہر ہے تو 'کشتی' عوام الناس کی زندگی کی ہی معقول علامت گردانی جائے گی۔'کشتی پار ہونا' بھی ایک محاورہ ہے۔اسی طرح کے لاتعداد امثال یکجا کر کے انکا تفصیل وتشریح کے ساتھ تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔

مقامی ہندی کوی مرحوم شری نند کشور رجنیشؔ نے ہندو معاشرے میں جہیز کے فقدان کے ہی موجب عموماً جوان دختران کی شادی نہ ہو پانے کے درد کو ہندو مذہبی دیومالائی اصطلاحات (مائی تھالوجی) اور 'دھنُش' اور 'ڈوری' کے استعارات سے یوں بخوبی بیان کیا تھا:

پِتا وِدیہ (۱) بن بیٹھے ہیں، اب تو کوئی رام ملے
گھر گھر تنی ہوئی ڈوری کے دھنُش انیکوں پڑے ہوئے

۱۔دیوی سیتا کے والد بادشاہ جنک

اسی طنز کو منور رانا نے 'اندھیرا کرنا' اس ایک محارے کے توسط سے غریب غربا کے از حد افلاس کو اس طرح سے نشان زد کیا ہے:

مفلسی نے سارے آنگن کو اندھیرا کر دیا
بھائی خالی ہاتھ لوٹے اور بہنیں بجھ گئیں

اسی طرح کسی شخص کے قدموں میں گرنا بھی اسکے سطحی معنوں سے الگ ایک محاورے کے بطور بھی مستعمل ہوتا رہتا ہے۔معنی یہ ہوتا ہے کہ نہایت عاجزی سے فریاد وغیرہ کرنا۔

اردو اور ہندی وغیرہ زبانوں میں 'آگ لگانا یا لگا دینا' بھی ایک محاورہ ہے۔کہتے ہیں کہ شکیلؔ بدایونی نے فلموں میں جس مصرعے سے ہدایت کار کو متاثر کر کے فلمی نغمات میں اپنی شاندار پہل قدمی کی تھی، گیت یا نغمے کا وہ محاورے دار مصرعہ یہ تھا۔

ہم درد کا افسانہ دنیا کو سنا دیں گے
ہر دل میں محبت کی اک آگ لگا دیں گے

اسی طرح 'سُرخ ہونا' یا 'سُرخرو ہونا' بھی ایک محاورہ ہے، جس کی مدد سے تلک راج پارسؔ نے اس شعر کی تشکیل کی ہے:

سنور گیا ہوں تیرے رکھ رکھاؤ میں آکر
میں اور سرخ ہوا ہوں الاؤ میں آکر

'دَم نکلنا' بھی اپنے سطحی معنی سے مختلف ایک استعاراتی معنی، مثلاً قوتِ برداشت ختم ہونا وغیرہ سے بھی عبارت ہوا کرتا ہے۔

اسی طرح 'ٹوٹ پڑنا' فعل سے وابستہ متعدد محاورات زبانوں میں مروج رہے ہیں مثلاً آرزوؔ لکھنوی

جیسے شاعر نے ابھی ابھی نہا کر غسل خانے سے باہر نکلی کسی حسینہ کے بھیگے بالوں سے پانی کو جھٹکنے کے منظر کو دیکھ کر بدلی کے دفعتاً برس پڑنے کے تخیل سے اس طرح سے آراستہ کیا ہے کہ اس میں متذکرہ بالا محاورے کا تصرف دیدنی و گفتنی ہے اور مستزاد، اس سے آنکھوں سے وابستہ امیجری (ہندی زبان میں 'بِمب وِدھان') سے بھی بخوبی آراستہ پروازِ تخیل دیکھتے ہی بنتی ہے:۔

کس نے زلفوں سے یوں جھٹکا پانی
جھوم کے آئی گھٹا، ٹوٹ کے برسا پانی

ندا فاضلی صاحب نے تو مسجد کے دور ہونے کے ہی مساوی کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسانے کی بات اپنے اس مقبولِ عام شعر میں کی تھی:

گھر سے مسجد ہے بہت دور، چلو یوں کر لیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

لیکن ظفر گورکھپوری نے تو اسی ہنسی سے چار سو محیط اندھیرے ماحول کو گویا ایک اجالے سے خوشنما ہو جانے کا یوں تخیل کیا ہے:

تارے چھپ جائیں کہیں آسماں کالا ہو جائے
بچہ سوتے میں ہنسے اور اجالا ہو جائے

'اُجالا ہونا یا 'ہو جانا' فقرہ بھی اپنے سطحی معنی سے مزید ماحول کے خوشگوار ہونے وغیرہ مفہوم کا بھی آشکار کرنے والا محاورہ ہو سکتا ہے۔ ویسے بچوں کا سوتے ہوئے بیشتر ہنس پڑنا بھی ایک مشاہدۂ حیات رہا ہے، جس سے اس شعر کی موضوعاتی بلندگی مزید مہمیز ہو گئی ہے۔

اسی زمرے میں 'آسمان تاکنا' یا 'دیکھنا' کسی شخص کا اپنے خدا یا تقدیر کی جانب اپنی ساری توجہ کو دانستاً مبذول کرنا ہی ہوا کرتا ہے۔ اب شکیل اعظمی کا عملی کام کو بروئے کار لانے کے لیے یہ نصیحت آمیز شعر اسی دنیاوی محاورے کے بامعنی تصرف سے مزین یوں درج ہوا ہے۔

پروں کو کھول زمانہ اڑان دیکھتا ہے
زمین پہ بیٹھ کے کیا آسمان دیکھتا ہے

اسی شعر سے مشابہت رکھنے والا جون ایلیا کا یہ شعر بھی ہم انسانوں کی ایک عام فطرت کی بخوبی عکاسی کرتا ہے۔

یوں جو تکتا ہے آسمان میں تو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا

اسی طرح شعرا نے اردو شاعری کو ہزارہا تشبیہات سے آراستہ پیراستہ کرنے کی کلاسیکی روایت کا دامن تھامے رکھا ہے۔ مثلاً اس دور کے بلند پایہ شاعر جناب بشیر بدر کا یہ ایک شعر ہی اسی قول کی نمائندگی کے ساتھ ہی دورِ عصر میں باہمی تعلقات کی شکستگی کے بتدریج افزوں ہونے کی حقیقت کو ثابت کرنے والا ٹھہرتا ہے۔

آج دو ریل کی پٹریوں کی طرح
ساتھ چلنا ہے اور بولنا تک نہیں

(سہ ماہی جریدہ 'آمد'۔ شمارہ 8، صفحہ 45)

تشبیہ کے اسی ضمن میں مونا مہتاب صاحب کا ایک شعر ملحوظِ خاطر یہ ہے:

مرے بالوں کی چاندی سے گریزاں آج ہے وہ
کل جسے میرا چاندی سا بدن اچھا لگا ہے

ہندی کاویہ میں شعری صنعتوں میں جسے 'روپک' نام کے ارتھ النکار کے نام سے عبارت کیا جاتا ہے، اسی کو اردو کی صنعتِ شعری کے تحت 'استعارات' کے قبیل میں ہی رکھا جا سکتا ہے۔ اسکا ایک ہی موجب یہ رہا ہے، کہ اردو زبان میں استعاراتی یا علامتی زاویے سے کوئی وسیع مطالعہ یا تحقیق فی الحال نہیں کی گئی ہے۔ یہی ایک وجہ ہے کہ مبالغہ آرائی، تشبیہات، تقابل وغیرہ کو عموماً 'استعارات' کے ہی زمرے میں رکھ کر تمام نوعیت کے مطالعہ اور تحقیق کا کام چلانے کی روایت رہی ہے۔ لہٰذا اسی کی مثالوں میں فیض احمد فیض، ندا فاضلی، جاوید اختر اور میر طاہر علی رضوی کے مندرجہ ذیل یہ دو اشعار پیش کیے جا رہے ہیں:۔

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
(فیض احمد فیض)

دنیا جسے کہتے ہیں جادو کا کھلونا ہے
مل جائے تو مٹی ہے، کھو جائے تو سونا ہے
(ندا فاضلی)

باتوں میں دوستی کا امرت، سینوں میں زہر نفرتوں کا
پربت پہ پھول کھل رہے ہیں بیٹھا ہے غار میں درندہ
(جاوید اختر)

مکتب عشق کا دستور نرالہ دیکھا
اسکو چھٹی نہ ملے، جس کو سبق یاد رہے
(میر طاہر علی رضوی)

دیگر متن میں 'ملی' اور 'رہا' الفاظ بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ یہاں موٹے سیاہ حروف میں شائع الفاظ میں استعاراتی زبان کی مثالیں واضح طور پر منقوشِ خاطر ہیں۔ اس تجزیے کا کل حاصل یہی ہے کہ مواد یا موضوع ہو یا پھر ہیئت یا اسلوب شعرا کے آفاقی تخیل کی بے بہا پروازِ تخیل نے اردو شاعری کو غضب کی جلا بخشی ہے اور اس کے بغیر تو پوری شاعری ہی بے پر کی اڑانیں ہی لے سکتی تھی۔ طنز، مزاح، استعارات، تشبیہات، محاورات، ضرب المثال، وغیرہ کے ہی توانا توسط سے یہ شاعری تا حال ساری دنیا میں مقبولیت کے پرچم بلند کرتی آ رہی ہے اور مستقبل میں بھی ایسا ہی کرتی رہے گی، ایسی امید ہے۔ اگر اس تخیل سے پُرکشش ذہنی طور پر پختہ اور امیجری سے مملو نہ ہوتا تو یہ پرندہ نہ جانے آسمانوں میں پرواز افروز نہ ہو کر کب کا مضمحل ہو کر زمین دوز ہی ہو چکا ہوتا۔ جب جب کوئی شاعر اسٹیج پر کسی تخیل سے لبریز شعر کہتا ہے، تو گویا کوئی سامع مومن خاں مومن کا یہ قدیم شعر گنگنانے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے، آواز تو دیکھو

□□□

دیپک دانش
مالویہ نگر، نزد ستی چورا، الٰہ آباد
موبائل: 9425283135

جہان خوابوں کا

ہے اس جہاں سے حقیقی جہان خوابوں میں
رہے ہے تو جو شب و روز میرے خوابوں میں

اسیر میں نہ ہوا دہر کے سوالوں کا
ہے تو ہی تو جو ہمیشہ میرے جوابوں میں

چھپا کے خود کو کہیں دور ان نگاہوں سے
مرے جہاں کو بدلتی ہے تو حجابوں میں

ہوئی کبھی جو تو خوابوں میں بھی جدا مجھ سے
ملی تھی پھر تو مجھے علم کی کتابوں میں

ابھی مکیں تھا وہ تخلیق حسن رُخِ میں ترے
تھا مبتلا وہ ترے حسن کے خطابوں میں

بنائے پھول جب اس نے مرے چمن کیلئے
چڑھا کے رنگ محبت کے ان شبابوں میں

ہے اک کنول کا سا احساس تیرا، دل میں مرے
نہیں ہے وصل کوئی اور اب حسابوں میں

ملی پناہ جو دلبر ترے تصور میں
مجھے ہے خلد بھی فرقت کے ان خرابوں میں

نالۂ درد

تو دور ہے میں تجھ کو پکاروں تو کس طرح
آنکھوں میں تیرا عکس اتاروں تو کس طرح

مٹتے نہیں ہیں فاصلے حسرت کی تاب سے
ان فاصلوں سے خود کو گزاروں تو کس طرح

اکثر سطوح عشق میں پڑتی ہیں سلوٹیں
اکثر وفا کی موج بھی لیتی ہیں کروٹیں
ہے کچھ دنوں سے دل میں چلی یاس کی صبا
بکھرے چمن کو پھر سے سنواروں تو کس طرح

تیرے لبوں سے تھے مرے گل اور مری بہار
تھے تیرے گیسوؤں سے مرے ابر و آبشار
روشن تھا اک جہاں تری آنکھوں کے نور سے
ان وسعتوں میں تجھ کو نہاروں تو کس طرح

تیری محبتوں کو میں پاکر نہ پا سکا
اک وادیٔ غرور میں جاکر نہ آسکا
اور بخش کر تجھے بھی سروکارِ دردِ دل
رسوائیوں سے دل کو اباروں تو کس طرح

قسمت کی چاہتوں کا مداوا تو کچھ نہیں
اک بے وفا کا عشق میں دعویٰ تو کچھ نہیں
پھر بھی کہو کہ میں تری نسبت کی آن کو
تجدید عاشقی سے نکھاروں تو کس طرح

دل کو وفا کی راہ میں پہلے جفا ملی
دنیا بھی رسم عشق سے اکثر خفا ملی
ہے ہوشیاریوں کا جہاں عشق سے تضاد
اس حال میں بھی تجھ کو بساروں تو کس طرح

غزلیں

سنجے مصرا شوق
kha/238538، کھدرا، سیتاپور روڈ، لکھنؤ
موبائل: 9795455897

جو انتظار کی آنکھوں میں پلنے لگتا ہے
تو درد پھول سے زائد مہکنے لگتا ہے

امیرِ قافلۂ صبر! تیری ہمت سے
تمام دشت کا چہرہ چمکنے لگتا ہے

میں اپنے قد کو گھٹاتا ہوں انکساری میں
خوشی سے ہر کوئی بونا اچھلنے لگتا ہے

یہ جل رہا ہے جو مجھ میں الاؤ وحشت کا
کسی کی یاد میں اکثر بھڑکنے لگتا ہے

کسی کی بیٹی کی جب بھی برائی ہوتی ہے
تو ایک بوڑھا اچانک بلکنے لگتا ہے

کسی کے عشق میں رسوائیوں کا تحفہ ہوں
جو دیکھتا ہے مجھے وہ دمکنے لگتا ہے

خیال لمبے سفر پر کبھی نہیں جاتا
ذرا سا سوچ لوں تجھ کو تو تھکنے لگتا ہے۔

وہ میرے ہونٹوں کا بوسہ تو چاہتا ہے مگر
قدم بڑھانے سے پہلے جھجکنے لگتا ہے

بارش میں سر جھکائے ہوئے تن کو موڑ کے
بیٹھا ہے اک پرند پروں کو سکوڑ کے

دو دن میں آ نہ جائے کہیں فکر پر زوال
رکھا نہیں ہے آپ نے یہ کھیت گوڑ کے

تلخی مری زبان پہ جمتی نہیں کبھی
پیتا ہوں روز نیم کی پتی نچوڑ کے

صدیوں سے چل رہی ہے فنا اور بقا کی جنگ
پیپل نکل رہا ہے مری چھت کو توڑ کے

اس پر ہی قتلِ عام کا الزام آ گیا
ملتا تھا جو سبھی سے بہت ہاتھ جوڑ کے

جوگی تمہارے دھیان کا بچہ بھی خوب ہے
میلے میں آ گیا ہے بھرے گھر کو چھوڑ کے

آنکھوں میں بس گئے تھے بہت سے سنہرے خواب
موت آئی اور جگا دیا شانے جھنجھوڑ کے

احساس جرم نے مجھے سونے نہیں دیا
پچھتا رہا ہوں پھول سے خوشبو نچوڑ کے

اس یارِ بے وفا سے جدا کیا ہوئے کہ بس
تن من چلا گیا ہے مرا ساتھ چھوڑ کے

غزلیں

راکیش راہیؔ
C-84، سیکٹر بی، علی گنج، لکھنؤ
موبائل: 9415334449

جو خشک جھیل کی مٹی سے آب مانگتے ہیں
وہ اندھکار سے رنگوں کے خواب مانگتے ہیں

لہو پلاتے ہیں جو لوگ ہم کو جیون بھر
وہ شام ہوتے ہی کیونکر شراب مانگتے ہیں

انہیں خبر ہی نہیں ہے خود اپنے ہونے کی
جو ہر سوال سے پہلے جواب مانگتے ہیں

وہ قتل کرنے کی آتے ہیں خواہشیں لے کر
جو مانگتے ہیں تو تازہ گلاب مانگتے ہیں

بھلا کے رکھتے ہیں وہ لوگ سچ کی کڑواہٹ
جو میٹھے لفظوں کی ہر دم نقاب مانگتے ہیں

ہماری عمر بھی لگ جائے ان کو اے مولا
جو دائروں سے نکل کر نصاب مانگتے ہیں

عمل کی راہ سے غافل ہے جو وہی راہیؔ
خدا سے اپنے دکھوں کا حساب مانگتے ہیں

جنبش کسے میں دوں کہ کوئی چاک بھی نہیں
مجھ کو ہوائے شہر کا ادراک بھی نہیں

مذہب کے تاجروں سے بچے ہیں اسی لئے
اس شہر کے تو لوگ خطرناک بھی نہیں

بارش کے باوجود شجر سوکھنے لگے
دھرتی کے پاس اب کوئی پوشاک بھی نہیں

کیا کیا گنوا دیا ہے تمہارے فراق میں
جوش جنوں میں اب کوئی ادراک بھی نہیں

تحریر وقت میں ہے ہمارا لہو مگر
قاتل ہمارے شہر کے سفاک بھی نہیں

دانشوران شہر کو یہ جام ہے بہت
ہم سا تو کوئی شہر میں چالاک بھی نہیں

کل تک جو آسمان بنے تھے زمین پر
اب ڈھونڈئے تو ان کی یہاں خاک بھی نہیں

کب سے بھٹک رہے ہیں تری جستجو میں ہم
اپنی کوئی زمیں کوئی افلاک بھی نہیں

راہیؔ کو چاہئے یہاں سب کی سلامتی
اس فکر کے سوا کوئی املاک بھی نہیں

غزلیں

پونم کوثر
402، وشال ٹاور، فیروز پور روڈ، لدھیانہ
موبائل: 9815775894

تمہارے چاہنے والوں میں جب میرا شمار آیا
یہ دل کا درد بھی، مہمان بن کے بار بار آیا

غزل تو آنسوؤں میں ڈوب کر بھی خوبصورت تھی
مگر ڈوبی جگر کے خوں میں تو کیسا نکھار آیا

وہ کل جو مر گیا تیری گلی میں اک مسافر تھا
جو دل کا بوجھ تھک کر تیرے کوچے میں اتار آیا

وہ تیر انداز بھی کب تھا، مگر اس نے چلایا جو
نہیں چوکا کوئی، ہر تیر میرے دل کے پار آیا

مری آنکھوں پہ تھا کوثرؔ اثر بارش کے موسم کا
خبر تک ہی نہ ہو پائی کہ جب رنگ بہار آیا

جب سے دنیادار ہوئے
ہم کتنے عیار ہوئے

بچپن میں جو بھی تھے
اب بس حصے دار ہوئے

کھلے کھلے سانجے آنگن
سمٹے اور دیوار ہوئے

ملنا جلنا کبھی کبھی
رشتے بھی تہوار ہوئے

بابا کچھ دن ٹھہریں گے
آخر رشتے دار ہوئے

کون منائے روٹھے کو
سب کے سب خوددار ہوئے

بستے تھے جو آنکھوں میں
سپنے بے گھر بار ہوئے

صدیاں بیت گئیں کوثرؔ
من بینا جھنکار ہوئے

غزلیں

نلنی وبھانازلی
نارائن نگر، پوسٹ بھوٹا، ہمیر پور
موبائل: 9418304634

قیس کو لیلیٰ نہ رانجھے کو کبھی ہیر ملی
طالب عشق کو کب خواب کی تعبیر ملی

سوز، غم، یاس، تڑپ، اشک، فغاں، تنہائی
واہ! کیا خوب وفاکیش کو جاگیر ملی

زندگی قید کی مانند تھی، جس میں ہردم
جسم کو طوق ملا، روح کو زنجیر ملی

نام تیرا ہی رہا ورد زباں شام و سحر
بس شب زیست میں اک تیری ہی تنویر ملی

ہم نہ ہوتے تو کہاں ہوتا یہ افسانۂ دل
اپنے ہونے سے ہی اس لفظ کو توقیر ملی

جذبۂ عشق کی تسخیر نہیں ہے ممکن
لوح گزراں پہ یہ لکھی ہوئی تحریر ملی

نازلیؔ جس نے محبت پہ ستم ڈھائے ہیں
خوب روئے گا وہ جس دن اسے تعزیر ملی

جہاں تک ہو سکے اپنے دلوں میں عاجزی رکھنا
خودی کو چھوڑ کر دل میں خدا کی بندگی رکھنا

ترے ہاتھوں نہ بیڑا ڈوبنے پائے کسی کا بھی
تو رکھنا پاس نیکی، دور اپنے سے بدی رکھنا

نہ بننا سنگ دل ہرگز، بھلے تو کتنا غصہ ہو
پڑوسی سے محبت، بھائی چارہ، آشتی رکھنا

نہ لے احساں کسی کا چاہے کتنا دوستانہ ہو
کسی پر وارنے کو ہاں مگر اپنی خوشی رکھنا

گڑھے تو جب بھی پیکر اپنے انساں کا مرے مولا!
جو علم و فن کا امرت پی سکے، وہ تشنگی رکھنا

کسی معصوم کی یارب! نہ کوئی آبرو لوٹے
درندوں، بدچلن لوگوں کے دل میں خوف بھی رکھنا

جہان رنگ و بو کے چھل فریبوں، داؤں پیچوں سے
بچا کر نازلیؔ کی تو ہمیشہ زندگی رکھنا

خوبصورت پل

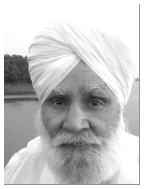

رتن سنگھ
A-402، بیٹا۔ا، گریٹر نوئیڈا
موبائل: 9911146994

اس دن میری زندگی میں ایک پل ایسا آیا جس نے بیتے ہوئے کئی خوبصورت پلوں کی یاد تازہ کر دی۔

نہیں! کہنا یہ چاہئے کہ وہ پل ان واقعات کو دوبارہ دہرانے لگے جو میری زندگی کو خوبصورت بناتے ہیں۔

میں چار پانچ سال کا بچہ ہوں۔ اپنے ہم عمر دوست کے ساتھ اس کے گھر گیا ہوں۔ اپنے بیٹے کی نسبت مجھے زیادہ صاف ستھرا دیکھ کر اس کی ماں نے مجھے چھاتی سے چمٹا لیا۔ میرے گالوں کو چوما اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر بولی،

'تو بھی اسی کی طرح صاف ستھرا رہا کر، دیکھ تو کیا شکل بنا رکھی ہے اپنی۔' اس نے بشیر سے کہا اور ایک پھر مجھے اسی طرح پیار کرنے لگی۔

تب وہ کمہارن مجھے بہت اچھی لگی تھی۔

اتنی خوبصورت، اتنی خوبصورت کہ پھر زندگی بھر اور کوئی خوبصورتی نظروں میں جچی ہی نہیں۔ ایک سے ایک خوبصورت عورتیں دیکھیں لیکن سب کی سب اس کمہارن کے سامنے انیس ہی لگیں۔ اس سے بیس کوئی نہیں دکھی۔

نیچے آنگن میں سیاپا ہو رہا تھا۔ میرے پھوپھا جوانی میں ہی مر گئے تھے۔ سیاپا کرنے والی عورتوں کے ہاتھ پہلے جانگھوں کو پیٹتے پھر چھاتی کو اور پھر گالوں کو۔ ان کے ہاتھ اس طرح ایک ساتھ اٹھتے تھے جیسے فوجیوں کی قواعد میں ہوتا ہے۔ گالوں کو پیٹنے کے بعد سب عورتیں ایک ساتھ بولیں۔

ہائے! مر گیا شیر
ہائے! مر گیا دلیر

اور پھر پیٹنے کا وہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔

تب میں اور میری ہم عمر لڑکی چھت کی منڈیر پر لٹکے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ ہمارے لئے یہ ایک دلچسپ کھیل تھا۔ ہم دیکھ رہے تھے اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا رہے تھے۔

تب اس لڑکی مسکراہٹ مجھے ایسی بھائی، ایسی بھائی کہ آج تک آنکھوں میں سمائی ہوئی ہے۔ دل میں بسی ہوئی ہے، زندگی کی صبح، دوپہر میں بدلی، شام میں ڈھلی، رات کا اندھیرا اترنے کو ہے، لیکن وقت ٹھہر گیا ہے۔

اندھیرا اس لئے نہیں اترپاتا کیونکہ.... اس لڑکی کی خوبصورت چہرے کی دمک کے سامنے تمام اندھیرے مات کھا جاتے ہیں۔

بات نانیہال کی ہے۔ اس لڑکی کی شکل دیکھی تو پھر دیکھتے کا دیکھتا ہی رہ گیا۔ یہ بھی بھول گیا کہ کس کام سے گھر سے نکلا تھا۔

اور پھر یہ ہوتا تھا کہ گھر سے نکلتے وقت میں باہری دروازے کو اتنے زور سے بند کرتا تھا کہ اس کی آواز پڑوس میں اس کے گھر تک پہنچ جائے۔ پھر کیا؟

اِدھر میں پٹ بند کرتا اُدھر حسن اپنے گھر کے پٹ کھول کر جلوہ دکھانے کے لئے موجود۔ نشہ چڑھ جاتا تھا، م اس کی ایک جھلک دیکھ کر۔

وہ اتنی خوبصورت تھی کہ اسکول جاتے وقت نانی کا حکم تھا کہ گرودوارے میں ماتھا ٹیک کر اسکول جانا لیکن میں۔۔۔۔

اس حسن کی دیوی کے درشن کرنے کے بعد مجھے اور کسی کے درشن کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

تبھی یادوں کے بحر بیکراں میں ایک اور لہر ابھری اور وہ ایک خوبصورت دلہن بن کر میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

میں کنڈلا پورٹ سے گوا جا رہا تھا اور سمندری جہاز کے کنارے پر کھڑا سمندر کی لہروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تبھی میں نے اپنی سانسوں میں نسوانی خوشبو سی محسوس کی۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک نئی نویلی دلہن میری طرف دیکھ رہی تھی۔

'ایک بات کہوں؟'

'کہیئے!'

'بچپن سے آپ جیسے دولہے کی چاہت پال رکھی تھی۔' اس نے کہا۔ میری طرف مسکرا کر دیکھا اور پھر جہاز میں اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گئی۔

میں نے محسوس کیا، جیسے سمندر کی لہر ہی دلہن بنی اور اپنی چاہت کا اظہار کر کے چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد جب میں اپنی جگہ پر بیٹھنے کے لئے جا رہا تھا تو اس دلہن نے پلیٹ میں چمچ مار کر اشارہ کیا کہ وہ ادھر بیٹھی ہے۔

یہ اور اس طرح کے چند ایک اور واقعات قطار در قطار ذہن کے پٹ پر دستک دے رہے تھے جن کو میں نے قیمتی سرمائے کی طرح سنبھال سہیج کر رکھا ہے۔ جب کبھی ایسا ہوتا ہے، ذہن ان کو دہراتا ہے تو ایک تسکین سی محسوس ہوتی ہے۔

مزا آجاتا ہے۔

بڑا اچھا لگتا ہے۔

تبھی ایک دن یہ ہوا کہ.....

ابھی جو میں نے کہانیاں بیان کی ہیں، ان کے کرداروں جیسی ہی ایک لڑکی میرے کمرے میں آئی۔

اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر میرے دل میں فطری جذبات کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے اندر لغزش پیدا ہوئی، نیلے جذبات کا ریلا سا آیا اور....

میں نے اس لڑکی کی طرف بدنیتی سے دیکھا۔

'بری بات۔۔۔

ہم سب دیکھ رہے ہیں'۔

یہ کس کی آواز ہے۔ میں سوچنے لگا۔ کمرے میں تو میرے اور اس لڑکی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔

'ہم ہیں'۔

میں نے غور سے دیکھا۔ ان تینوں کہانیوں کے کردار کمرے میں ایک ساتھ دکھائی دئے اور پھر اوجھل ہو گئے۔

دکھائی دیتے اور پھر اوجھل ہو گئے۔

میں اشارہ سمجھ گیا۔

بیتے ہوئے خوبصورت پلوں نے زندگی کے اجلے آنچل کو میلا ہونے سے بچا لیا تھا۔

❑❑❑

ساقی فاروقی

'پاپ بیتی' ہو یا ان کی دوسری تخلیقات، ایسا ممکن ہی نہیں تھا کہ ساقی فاروقی کچھ لکھیں اور عالمی پیمانے پر سرخیوں میں نہ آئیں۔ ساقی فاروقی کی ۸۲ویں سالگرہ کے موقع پر دسمبر ۲۰۱۸ کا 'نیا دور' ساقی فاروقی پر مبنی ہوگا جس میں **بیدار بخت، اسد محمد خان، مشرف عالم ذوقی، زمرد مغل** وغیرہ کے مضامین شامل ہوں گے۔

اودھ نمبر کتابی شکل میں

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک 'اودھ نمبر' بھی ہے جسے دو حصوں شائع کیا گیا تھا۔ اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اردو ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰/روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰/روپئے ملا کر کل قیمت ۲۵۰/روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

تہذیب کا تسلُّط

دیپک بدکی

A-102، ایس جی امپریشن، سیکٹر B-4، وسندھرا،
غازی آباد موبائل: 9868271199

عجیب سی لڑکی تھی وہ۔ اس سے میری ملاقات اتفاق سے ایک دوست کی دُکان پر ہوئی۔

شیلانگ کے پولیس بازار میں میرے دوست ہرپال سنگھ کی ٹیلی ویژن کی دکان تھی۔ وہاں پر اکثر نئے چہرے دیکھنے کو ملتے تھے خاص کر جب اس کے پاس نئے ٹیلی ویژن سیٹ اور میوزک سسٹمز آجاتے تھے۔ ابھی ٹرک سے اتارے بھی نہیں جاتے کہ گاہکوں کی بھیڑ لگ جاتی تھی۔ ان دنوں دو چار کمپنیاں ہی یہ چیزیں بناتی تھیں، اس لیے بہت مانگ رہتی تھی۔ ایک روز جب میں دکان میں بیٹھا اس کے ساتھ گپیں ہانک رہا تھا، ایک لڑکی دکان میں داخل ہوئی اور ہرپال کے ساتھ ایسے باتیں کرنے لگی جیسے برسوں کی جان پہچان ہو۔ ہرپال نے میرا ابھی تعارف کرایا اور پھر وہ میرے ساتھ بھی گھل مل گئی۔ بہت دیر تک ہم باتیں کرتے رہے اور اُدھر ہرپال دوسرے گاہکوں کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ اسی دوران میں نے لڑکی کو سینما دیکھنے کے لیے دعوت دی۔ جواباً اس نے معذرت کا اظہار کیا مگر یہ وعدہ کر کے گئی کہ آنے والے اتوار کو وہ رِٹز سینما کے باہر میٹنی شو کے وقت میرا انتظار کرے گی۔ میری تو باچھیں کھل گئیں۔ میں دن کیا، گھنٹے اور منٹ گننے لگا۔

پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ عورت نرالی مخلوق ہے، انسان کے وجود کو منقلب کر دیتی ہے۔ اور پھر اتوار کا وہ مقررہ ٹائم آ گیا۔ وہ سینما گھر کے باہر میرا انتظار کر رہی تھی اور مجھے دیکھتے ہی چلّا اٹھی۔ ''ہائے، چیٹر پال ۔۔۔ ہیلو!'' اس نے میرے نام چھتّر پال سنگھ کا فالودہ بنایا۔

''ہیلو کِرسوئی، آئی ایم سوری۔۔۔۔ بہت دیر انتظار کرنا پڑا ہوگا۔'' میں نے اس کے نام کرسوئیلا نگ شیشا کا مخفف بنا کر انکساری سے جواب دیا۔

''ناٹ ایٹ آل۔۔۔ میں بھی چند منٹ پہلے ہی پہنچی ہوں۔''

''اوہ۔۔۔ پھر تو ٹھیک ہے۔ میں سمجھا میں ہی لیٹ ہو گیا۔''

''چلے گا۔'' اسے ہندستانی بولنے میں تھوڑی بہت دقت تو آ رہی تھی مگر دوسرے مقامی باشندوں کے مقابلے میں کافی حد تک سمجھ بھی لیتی تھی اور بول بھی لیتی تھی۔

وہ کھاسی قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ ناک نقشہ چینیوں جیسا، گول مٹول بھرا بھرا چہرہ، ترچھی آنکھیں، ترشے ہوئے بال آبشار کی مانند کاندھوں پر گرے ہوئے، بدن چکنا اور ہموار جیسے ریگ مال سے صیقل کیا ہوا۔ اس کے جسم پر کہیں کوئی نمایاں ابھار نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ قمیص اور جینز میں ملبوس تھی۔ نارتھ ایسٹ میں مجھے کئی قبیلوں سے واسطہ پڑا ہے، سبھی ایک جیسے لگتے ہیں، مگر طور طریق ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ رہن سہن اور عقیدوں میں بھی کافی تفاوت ہے۔

سینما ہال میں گھپ اندھیرا تھا کیونکہ فلم شروع ہو چکا تھا البتہ سکرین سے آ رہی روشنی کی شعائیں اکثر ناظرین کے چہروں پر پڑ رہی تھیں۔

''تمھیں ہندی فلم سمجھ آتا ہے کیا؟'' میں نے کرسی میں بیٹھتے ہوئے پوچھ لیا۔

''ہاں کیوں نہیں۔ آئی انڈرسٹینڈ اٹ فُلی۔ پر تم نے کیوں پوچھا؟''

''مجھے اکثر یہاں لوگوں سے بات کرنے میں پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ انھیں ہندی سمجھنے میں دقّت ہوتی ہے۔''

''ہاں، یو آر رائٹ۔ جو غیر تعلیم یافتہ کھاسی ہیں وہ مشکل سے کھاسی زبان کے بغیر اور کوئی زبان سمجھ لیتے ہیں۔ مگر میں نے تو دہلی سے گریجویشن کیا ہے۔ ہندی وہیں سیکھ لی تھی۔''

''اوہ۔۔۔ سمجھ گیا۔ دراصل غلطی میری ہی ہے۔ آج کل ایسٹرن انڈیا اور ویسٹرن انڈیا کے درمیان انٹر ایکشن اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ اب ایک دوسرے کو سمجھنے میں زیادہ مشکل نہیں ہوتی۔''

باتوں باتوں میں نہ جانے وقت کیسے بیتا۔ فلم بہت اچھا تھی۔ امیتابھ بچن اور ریکھا کا عشق پروان چڑھ رہا تھا۔ فلم کا ٹائٹل تھا 'سلسلہ'۔ جی تو چاہ رہا تھا کہ فلم پوری توجہ سے دیکھ لوں مگر بغل میں جو انگیٹھی تھی وہ فلم پر مرتکز ہونے نہیں دیتی تھی۔ میں نے اپنے داہنے ہاتھ میں اس کا ہاتھ لے رکھا تھا جب کہ بایاں ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھ کر اس کے بالوں کو سہلا رہا تھا۔ ساری فلم اسی پراگندہ خیالی میں دیکھ لیا یہاں تک کہ اس کے دل کی دھڑکنیں بھی سنتا رہا۔ کبھی کبھار جب سینما کے پردے سے تیز روشنی پھیل جاتی وہ میری طرف ترچھی نظروں سے دیکھتی اور مجھے اس کے لبوں کی پیاس کا اندازہ ہو جاتا۔ دفعتاً میں اس کو قریب کھینچ لیتا اور اس

کے لبوں پر ایک زوردار طویل بوسہ دے کر اس کو سیر کرنے کی کوشش کرتا۔ اس تناتنی میں پتہ ہی نہیں چلا کہ تین گھنٹے کیسے بیت گئے۔ سینما سے باہر آئے اور وہ میری جانب سوالیہ نظروں سے ایسے دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو کہ اب کیا ارادہ ہے۔

''فرصت ہو تو چلو میرے گھر چلیں۔ میں آج کل اکیلا ہوں۔ ڈنر بھی ساتھ ہی لے کر چلیں گے۔''

''کیوں گھر میں اور کوئی نہیں ہے؟''

''نہیں۔ میری فیملی اپنے گاؤں چلی گئی ہے۔ بچوں کی چھٹیاں جو ہیں۔''

''اچھا، تبھی تو تم بہت خوش نظر آرہے ہو۔ ٹھیک ہے، چلو وہیں چلیں گے۔'' وہ موٹر سائیکل پر میرے پیچھے بیٹھ گئی اور موٹر سائیکل فراٹے بھرتے ہوئے آگے نکلا۔ راستے میں بازار سے ڈنر پیک کروایا اور پھر گھر پہنچ گئے۔

''یہ مکان تمھارا ہے؟'' وہ حیرت زدہ دکھائی دے رہی تھی۔

''نہیں، یہ سرکاری مکان ہے۔ الاٹ ہوا ہے مجھے۔ یہاں میرا ٹرانسفر ایک سال پہلے ہوا تھا۔''

''اوہ آئی سی، یہاں نوکری کرنے کے لیے آئے ہو۔''

''یس یو آر رائٹ۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ مسکرا دی۔ اور میں نے بھی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ ہی سے دیا۔

ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہی میں نے الماری سے وھسکی کی بوتل نکالی، کچن سے دو گلاس اور پلیٹ میں کچھ نمکین لایا اور اس کو پیش کیا۔ دراصل مجھے اس بات کا احساس تھا کہ مقامی لوگ، مرد ہو یا عورت، شراب پینے کے شوقین ہیں اور ان کا استقبال شراب سے کیا جائے تو انھیں بہت اچھا لگتا ہے۔ کرسوئی کی مسرت اس کے چہرے پر رقصاں تھی۔ اس نے وھسکی کا گلاس ہاتھ میں تھام کر میرے گلاس کے ساتھ ٹکرایا اور اونچی آواز میں بول اٹھی۔ ''چیئرس''

میں نے بھی آواز اونچی کی۔ ''چیئرس''

''چیٹر پال، اس وقت بازار میں سگریٹ مل سکتی ہے کیا؟ تمھیں پرابلم تو نہیں ہوگا۔'' مجھے اس کے منہ سے اپنا نام سن کر ہنسی تو آرہی تھی مگر کچھ لطف بھی آرہا تھا۔

میں اٹھا اور الماری سے سگریٹ کا ایک پیکٹ اور ماچس نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ حیران ہوگئی۔ اس کی حیرانی کو دیکھ کر میں گویا ہوا۔ ''نیور مائنڈ، مجھے کالج کے ہوسٹل میں سگریٹ پینے کی عادت پڑ گئی تھی۔ مگر سب کے سامنے نہیں پیتا، صرف کچھ قریبی دوستوں کے ساتھ۔

کچھ وقفے کے بعد میں نے اس سے سوال کیا۔ ''تم جاب کیوں نہیں کرتی۔ تم نے کہا تھا کہ تم گریجویٹ ہو۔''

''سو تو ہوں مگر یہاں نوکریاں کہاں ملتی ہیں۔ نوکری کرنے کے لیے کولکاتا یا کسی اور بڑے شہر جانا پڑے گا۔ تم نے یہاں بڑا بازار دیکھا ہے کیا، وہاں تم کو گریجویٹ لڑکیاں سبزیاں بیچتی نظر آئیں گی۔''

''کیوں مرد لوگ دُکانوں پر نہیں بیٹھتے؟''

''مرد۔۔۔! یہ بھی خوب کہی تم نے۔ لگتا ہے تم یہاں کے کلچر سے پوری طرح واقف نہیں ہو۔ ہمارا معاشرہ عورت اساس معاشرہ ہے۔ یہاں میٹری لینیل سسٹم لاگو ہے جس میں مادر سری اور شجرۂ مادری کا چلن ہے۔ لڑکیوں کو والدین کی ساری جائیداد کا وارث مانا جاتا ہے جبکہ لڑکوں کو کچھ بھی نہیں ملتا۔ سبھی مرد چاہتے ہیں کہ ایسے خاندان کی لڑکی سے شادی کر لیں جس کے پاس خوب ساری دولت ہو۔ عورت کی تو ٹھاٹھ ہوتی ہے۔ عورتیں گھر سے باہر جاتی ہیں اور آزادی سے گھوم پھر لیتی ہیں۔ زیادہ تر کام کاج بھی وہی کر لیتی ہیں اور گھر کے لیے کماتی بھی وہی ہیں۔ نٹھلے مرد تو یونہی دن بھر دارو پی کر ٹنڈ پڑے رہتے ہیں۔ کام چور ہیں اور کوئی کام کرنے کا نام بھی نہیں لیتے۔ بیوی کی کمائی اور جائیداد پر عمر بھر انحصار کرتے ہیں۔ اسی لیے مردوں پر عورتوں کا غلبہ رہتا ہے۔''

''تمہارے پتاجی تو ہوں گا۔ کیا وہ بھی۔۔۔''

میں نے فقرہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

''فادر۔۔۔!'' اس کے منہ سے زوردار قہقہہ نکلا۔ ''میرے پتاجی کہاں ہیں۔ وہ تو میری ماں کو چھوڑ کر واپس انگلینڈ چلے گئے۔ وہ کھاسی قبائیلوں کو تہذیب سکھانے کے لیے انگلینڈ سے آئے تھے۔ سو سکھا کر چلے گئے۔'' اس کے لہجے میں طنز بھی تھا اور تلخی بھی۔

''میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''سمجھو گے کیسے۔ دراصل میں ایک ایسے فرنگی کی اولاد ہوں جس کو یہاں تبلیغ کے لیے بھیجا گیا تھا۔ پاس ہی ایک گرجے میں رہتا تھا۔ اس نے میری ماں پر آتے ہی ڈورے ڈال دیے۔ آزادی کے بعد بھی قریباً دس سال یہاں رہا۔ اپنی بیوی اور بچوں کو انگلینڈ میں چھوڑ کر آیا تھا۔ سال میں ایک دو مہینے ان سے ملنے چلا جاتا تھا۔ باقی وقت میری ماں کے ساتھ گزارتا تھا۔ اس نے میری ماں کو رکھیل بنا کر چھوڑا تھا۔''

''پھر۔۔۔۔''

''پھر کیا۔ اس کے خلاف بچوں کا جنسی استحصال کرنے کی افواہیں اڑ گئیں۔ لوگ مرنے مارنے پر آمادہ ہو گئے۔ انہی شکایتوں کی بنا پر اسے مجبوراً واپس انگلستان بھاگنا پڑا۔''

''تم لوگوں کو اپنے ساتھ نہیں لے گیا؟''

''کیسے لے جاتا؟ وہاں تو اس کی اپنی ایک بیوی تھی اور دو بچے۔ وہاں پہلی کو چھوڑنے کے بعد ہی دوسری شادی کی اجازت ملتی ہے۔ ورنہ اس کو لینے کے دینے پڑ جاتے۔ علاوہ ازیں اس نے کب ہم کو اپنا سمجھا۔ اس نے تو تفنن طبع کے لیے میری ماں کا آنچل تھاما تھا۔ جب بھی ہمارے گھر آتا بہت سارے گفٹ لے کر آتا۔ ماں بے چاری تو اس کے دام میں پھنس گئی تھی۔ اسے تو کلچرڈ بننے کا بھوت سوار ہو گیا تھا، کرتی کیا

بے چاری، اس کا دامن جو پکڑ لیا گیا تھا۔ وہ ماں کو تحت الانسانی مخلوق سمجھتا تھا۔ بے چاری کی کوئی انفرادیت ہی نہیں تھی۔''

''یہ تو میرے لیے کسی انکشاف سے کم نہیں۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ نارتھ ایسٹ کے قبائل لوگ وحشی، غیر مہذب اور بہت ہی قدامت پرست تھے۔ ان کرسچن پادریوں کی وجہ سے تعلیم وتمدن سے مالا مال ہوگئے۔ میں نے خود بھی کئی پڑھے لکھے لوگوں سے گفتگو کی ہے۔ وہ ان کی تعریفوں کے پُل باندھتے ہیں۔ میں نے شیلانگ میں جتنے بھی سکول وکالج دیکھے ہیں سب کے سب کرسچن مشنری ادارے ہیں۔''

''سو تو ہے۔ ان پادریوں کے دو ہی کام تھے، ایک انگریزی تعلیم دینا، دوسرا کرسچن مذہب کی ترویج کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ عام لوگوں کی بود و باش بھی انگریزی طرز کی ہوگئی ہے۔''

''کرسوئی، کیا تم بھی کرسچن ہو؟''

''اور ہو بھی کیا سکتی ہوں۔ ہمارے علاقے میں سبھی لوگوں نے اپنا مذہب چھوڑ کر عیسائیت اپنالی ہے۔ ان راہبوں کا تو یہی کام ہے۔ ہمیں سویلائز کرنا۔ جیسے ہم لوگ ان کے آنے سے پہلے جی نہیں رہے تھے۔ یہاں ہزاروں سالوں سے ہماری قومیں آباد ہیں۔''

''سویلائز کرنا؟ یعنی تہذیب یافتہ بنانا؟ مگر کیسے؟ یہاں کی عورتوں کو داشتہ بنا کر اور چھوٹے بچوں سے لواطت کر کے؟'' میں نے لقمہ دیا۔

''اس سچائی سے کوئی بھاگ نہیں سکتا۔ یہ لوگ جو ہمیں مہذب بنانے کا دعویٰ کرتے ہیں، ایک زمانے میں ہیومن ٹریفکنگ کرتے تھے۔ افریقی اور ایشیائی لوگوں کو غلام بنا کر امریکا اور دیگر یورپین ملکوں میں بیچتے تھے۔ ان کی استعماری کارستانیوں سے طسمانیہ کی پوری قوم نیست و نابود ہوگئی۔ میری دادی کہتی تھی کہ ہمارا قبائلی مذہب تھا۔ اپنے رسم ورواج تھے۔ معاشرے میں کہیں کوئی اونچ نیچ نہیں تھا، کوئی انتباہ نہیں اور یہاں سے جانے کے بعد کیا ہوگا اس کی کوئی چنتا نہیں۔ سب اپنے اپنے دائرے میں خوشی سے جی رہے تھے۔ پھر یہاں عیسائی راہبوں نے ڈیرہ ڈالنا شروع کیا۔ ان کے ذہن پر صرف گناہ سوار تھا۔ انھوں نے ہمیں سمجھایا کہ جو کچھ بھی ہم کر رہے ہیں وہ گناہ ہے۔ دادی یہ بھی کہتی تھی کہ ان کی باتیں سن کر ہمیں لگتا تھا کہ ہم غیر مہذب ہیں اور انھیں خدا نے ہمیں مہذب بنانے کے لیے ہی بھیجا ہے۔ وہ ہمیں عذابِ الٰہی سے بچانے کے لیے آئے ہیں۔ ان کی باتیں سن سن کر ہم ڈر جاتے تھے اور اس طرح ان کا مذہب اختیار کرنے کے لیے راضی ہوجاتے۔ جستہ جستہ سبھی لوگ کرسچن بن گئے۔''

''تمھیں کیا لگتا ہے کہ ایسی کون سی بات تھی جس کے سبب وہ تمھیں غیر تہذیب یافتہ کہتے تھے۔''

''میں نے تو اس طرف کبھی دھیان ہی نہیں دیا۔ یہ تو ہر استعماری ذہن کا ردِّعمل ہوتا ہے کہ وہ جس پر مسلط ہوتا ہے اس کو غیر مہذب کہتا ہے۔ کالونیل ذہنیت کے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔ ان مبلغوں نے ہمیں اپنی جڑوں سے اکھاڑ دیا اور ہمیں اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی۔ اس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی رہے۔ انھوں نے ہمیں کبھی انسان نہیں سمجھا بلکہ ہم ان کے لیے ہمیشہ جنگلی اور جاہل رہے۔ وہ ہمیں سمجھاتے رہے کہ کیسے خدا نے اپنے بیٹے کے توسط سے ساری دنیا میں روشنی پھیلا دی اور اب وہ اسی کے حکم کے مطابق دنیا کے باقی ماندہ علاقوں میں روشنی پھیلا رہے ہیں۔ میرا باپ یوں تضحیک بھرے لہجے میں بات کرتا تھا جیسے میری ماں اور اس کا سارا خاندان وحشی، جاہل اور گنوار تھے۔ کوئی تہذیب نہیں۔۔۔، کوئی تمدن نہیں۔۔۔! کبھی کبھی کہتا تھا کہ ہم لوگ تمھارے ملک میں نہ آتے تو تم لوگ نرے حیوان بنے رہتے۔ یہ سن کر ماں حیران ہوجاتی۔ کچھ کہہ بھی نہیں پاتی۔ آخر کہہ بھی کیا سکتی تھی۔ اس نے تو گناہ گار پادری کو اپنا مجازی خدا مان لیا تھا۔

''وہ پادری اب کہاں ہے؟''

''کسے معلوم؟ اپنے وطن میں ہوگا۔''

''جانے کے بعد کوئی خط وکتابت تو ہوئی ہوگی اس کی تمھاری ماں کے ساتھ۔''

''بالکل نہیں۔ طوطا چشم نکلا وہ۔ اس نے کبھی مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ میری ماں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ماں کے پاس زندگی بسر کرنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔''

''وہ اپنے وطن چلا گیا، اتنا تو میں سمجھ سکتا ہوں۔ اس کے وطن اور تمھارے وطن میں بہت انتر ہے۔ لندن کے بارے میں تو سنا ہی ہوگا۔ دنیا کے بہترین شہروں میں سے ایک ہے۔ سبھی سہولتیں دستیاب ہیں وہاں۔ اس کے برعکس یہ شیلانگ قدرتی حسن کا گہوارہ ہونے کے باوجود پچھڑا علاقہ ہے۔ کچھ بھی دستیاب نہیں۔ نہ ریل گاڑی، نہ مسلسل بجلی، نہ صاف پانی، نہ ہموار سڑکیں اور نہ ہی صنعتیں۔ اِدھر گوہاٹی آسام تک چند سال پہلے تک چھوٹی گیج کی ریل گاڑیاں چلتی تھیں اور اُدھر تین سکھیا تک ایسی ہی چھوٹی پٹری والی ریل گاڑیاں دوڑتی تھیں۔ باقی ماندہ نارتھ ایسٹ میں اب بھی کہیں ریل گاڑیاں نظر نہیں آتیں۔ فرنگی سرمایہ داروں کو یہاں کے باشندوں کی فلاح و بہبود مقصود نہیں تھی بلکہ ان علاقوں میں چائے اگتی تھی اور چائے باغان کے مالک اکثر انگریز تھے۔ انھوں نے اپنی اور اپنے مال کی ڈھلائی کے لیے یہ چھوٹی پٹریاں بچھائی تھیں۔ مقامی لوگوں کا جینا غربت اور بے روزگاری کے سبب دوبھر ہوتا رہا، نیم عریاں پنجر تپتی گرمی میں کھیتوں اور باغان میں کام کرتے رہے جب کہ یہ استعماری سوچ والے فرنگی ایک صدی سے زیادہ عرصے تک راج کرتے رہے مگر یہاں کے لوگوں کی حالت نہیں سدھار سکے۔ یہ لوگ بس وہاں ریل، ٹیلی گراف اور دیگر موڈرن سہولیات لے کر گئے جہاں ان کو کاروباری فائدہ مل سکتا تھا۔ انھیں مقامی لوگوں سے

کوئی غرض نہیں تھی۔''

گفتگو کے دوران کرسوئی بہت تیزی سے شراب کے گلاس پیتی رہی اور میں بڑی دریا دلی سے اس کا گلاس بھرتا گیا۔ اس پر کچھ کچھ غنودگی چھا رہی تھی۔ پھر وہ یکا یک جذباتی ہوگئی اور اپنا دل کھول کر بیٹھ گئی۔

''اس بلڈی فادر نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ ہم پیسے پیسے کے لیے محتاج ہوکر رہ گئے۔ دراصل میں دہلی پڑھنے کے لیے نہیں گئی تھی بلکہ روپیہ کمانے گئی تھی۔ دن میں کالج جاتی تھی اور رات کو ہوٹل میں کسی گاہک کا من بہلاتی تھی۔ میری ماں ہمیشہ علیل رہنے لگی تھی۔ وہ اب اٹھنے بیٹھنے کے لائق بھی نہ تھی۔ ایک اور بہن ہے وہ کلکتہ میں ہوٹلوں میں دھندا کرتی ہے۔ ماں بے چاری نے ہمیں پالا پوسا، بڑا کیا، جہاں تک پڑھا سکی، پڑھایا۔ ایک لڑکا تھا جو گھر چھوڑ کر بھاگ گیا اور کسی انڈر گراونڈ تنظیم میں شامل ہوگیا۔ تب سے اس کا کوئی اتا پتا نہیں۔ زندہ ہے یا مردہ، کسی کو معلوم نہیں۔ یہ چال بھی انھی انگریز پادریوں کی چلی ہوئی ہے۔ وہ مقامی لوگوں کو ہمیشہ بھڑکاتے رہے۔ کہتے تھے کہ اپنے حق کے لیے لڑو۔ کاش کوئی ان سے پوچھ لیتا کہ تم لوگوں نے ہمیں اپنا حق کیوں نہیں دیا۔ میری ماں اور اس جیسی بے شمار عورتوں کو یہاں بے یارومددگار چھوڑ کر کیوں بھاگ گئے۔''

بولتے بولتے کرسوئی کے آنسو بہہ نکلے۔ مجھے اس پر بہت رحم آ گیا۔ میں نے اسے بچے کی طرح اپنے گلے لگایا اور دلاسہ دیتا رہا۔ پھر میں نے جلدی سے سامان سمیٹ لیا اور بوتل الماری میں رکھ دی۔ اس کے بعد کچن میں جا کر پلیٹوں میں کھانا ڈال کر لے آیا۔ وہ کھانا زہر مار کرنے لگی کیونکہ اس کا نہ دل یہاں تھا نہ دماغ۔ میں اس کو لگاتار تسلیاں دیتا رہا اور بعضے اس کو خود چمچ سے کھانا کھلانے لگا۔ میرا رویہ دیکھ کر وہ کچھ کچھ سنبھل گئی۔ کھانا کھانے کے بعد اس پر نیند ترنت غالب آ گئی۔ وہ صوفے پر ہی اوندھی گر گئی۔ میں نے اسے گود میں اٹھا کر بستر پر لٹا دیا اور اوپر چادر ڈال دی۔

میں دیر رات تک نہیں سو پایا لیکن کرسوئی نہ جانے کس عالم میں پہنچ گئی۔ وہ شاید چھوٹے بچوں کی مانند خواب دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ شاید اسے آج بہت عرصے کے بعد رات بھر چین سے نیند کرنے کا موقع ملا تھا، اس لیے بڑے آرام سے خراٹے مارتے ہوئے سو رہی تھی۔

آدمی کے روپ بھی انیک ہوتے ہیں، ایک لمحے وہ حیوانیت کا مجسمہ بن جاتا ہے اور دوسرے ہی لمحے وہ انسانیت کا پُتلا بن جاتا ہے۔ جس کے پاس طاقت یا سرمایہ ہوتا ہے وہ اپنی انسانیت سوز بہیمی کارروائیوں پر مذہب کا پردہ ڈال دیتا ہے تاکہ اس کی اپنی عریانیت ظاہر نہ ہو۔ جب اس کا سورج ڈوب جاتا ہے تو انسانیت اور انسانی حقوق کا واسطہ دیتا ہے۔ صبح کرسوئی بہت جلدی نیند سے اٹھ گئی۔ جب تک میری آنکھیں کھلیں اس نے نوکرانی کا انتظار کیے بغیر ہی کچن صاف کر لیا تھا اور فرش پر جھاڑو بھی لگایا تھا۔ مجھے کچھ پتا ہی نہ چلا۔ پھر وہ کچن سے خود ہی بیڈ ٹی بنا کر لے آئی اور مجھے جگا دیا۔

''ہے چیئر سنگھ، اٹھو چائے پی لو۔'' میں اس کے لیے چیٹر پال سے چیئر سنگھ ہوگیا تھا۔

اس کو دیکھ کر میں حیران ہوا۔ وہ مریم کی مانند معصوم دوشیزہ لگ رہی تھی جس کے چہرے پر کہیں کوئی ملمع نہیں تھا۔ میں نے ٹرے سے اپنا کپ اٹھا لیا اور اس کو سامنے بیٹھنے کے لیے کہا۔

''کرسوئی، کل رات تجھے دین ودنیا کی خبر ہی نہیں رہی، کھانا کھاتے ہی سو گئی۔'' اس کے چہرے پر شوخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ معلوم نہیں اس نے کیا سمجھ لیا۔

''یو آر رائٹ چیئر سنگھ، تم نے بہت دارو پلائی نا اس لیے۔ تم ناراض تو نہیں ہو کہ تم جس لیے مجھے لائے تھے وہ کام نہیں ہوسکا۔'' آخر اس نے وہ بات، جو اس کے من میں پیدا ہوئی تھی، کہہ ہی ڈالی۔

''کم آن کرسوئی، تمھیں نہیں معلوم، تم کو میں دیر رات تک نہارتا رہا۔ تم مجھے ایک چھوٹی سی بچی کے موافق معلوم ہو رہی تھی۔ مجھے تمھارے چہرے سے ایک انوکھی معصومیت اور پاکیزگی ٹپکتے ہوئے محسوس ہو رہی تھی۔ اس وقت مجھے تم پر عجیب سا پیار آ رہا تھا۔ میں دیر رات تک تمھاری مجبوریوں پر سوچتا رہا۔ سمجھ نہیں آ رہا کہ اس دنیا میں کب انسانوں کی قدر ہوگی۔ ناخواندگی اور بے روزگاری کے سبب ہماری خواتین پر ہمیشہ ظلم ہوتا رہا ہے۔ کوئی بھی سماج ہو، پدرسری یا مادرسری، عورت ہمیشہ برابری کے لیے ترستی رہی ہے اور اس کے حقوق کو ہمیشہ نظرانداز کیا گیا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ انسان کا یہ رویہ کبھی نہ کبھی ضرور بدل جائے گا۔''

''جب تک یہ سب ہوگا تب تک تو ہمیں یونہی زندگی گزارنی پڑے گی ڈیئر۔''

''تم صحیح کہہ رہی ہو۔ خیر میں تمھیں ایک صلاح دے رہا ہوں۔ تم کو میں ڈاک خانے میں سیونگس ایجنسی اور لائف انشورنس کی ایجنسی دلا دوں گا۔ بہت محنت کرنی پڑے گی۔ جتنی محنت کروگی اتنا روپیہ کما سکتی ہو۔ بولو منظور ہے۔''

''اوہ چیئر سر، یو آر گریٹ۔ تم کو اندازہ نہیں ہوگا کہ میں خود اس زندگی سے کتنا تنگ آ چکی ہوں۔ اس ذلت کو چھوڑنے کی خاطر میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔ میں تمھاری عمر بھر آبھاری رہوں گی۔''

تھوڑی دیر میں میں نے ناشتہ بنا لیا اور اس کے سامنے رکھ دیا۔ ناشتہ کر کے وہ چلنے کو تیار ہوگئی۔ جاتے جاتے اس نے مجھے بہت ہی پیار بھرا طویل بوسہ عنایت کیا۔ اور پھر اجازت لے کر آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔

کچھ دنوں کے بعد وہ ہیڈ پوسٹ آفس کے سامنے سرمایہ کاروں کے فارم بھرتے ہوئے نظر آئی۔ دریں اثنا اس کو لائف انشورنس کارپوریشن کی ایجنسی بھی مل گئی۔ وہ پہلی لائف انشورنس پالیسی بیچنے کے لیے میرے پاس آئی اور میں نے ہنسی خوشی اپنی زندگی کا بیمہ اس کے ذریعے کروایا۔ مجھے اس کو دیکھ کر پہلی بار ایسا لگا کہ زندگی میں کم سے کم ایک نیک کام تو کر لیا۔

□□□

رینو بہل

1505، سیکٹر 49B، چنڈی گڑھ (پنجاب)

موبائل: 9781557700

لاگی چھوٹے نا

دوبارہ اس شہر میں جانا میری اخلاقی مجبوری تھی ورنہ جس طرح ذلیل اور بے آبرو ہوکر وہاں سے نکالا گیا تھا، دوبارہ وہاں جانا میرے لئے آسان نہیں تھا۔ ماموں کے انتقال کی خبر نے پریشان کر دیا تھا۔ پریشانی صرف لوٹ کر وہاں جانے کی تھی۔ شاید میں دوبارہ ادھر جانے کا ارادہ بھی نہیں کرتا اگر ماموں ناراضگی اور ترک تعلق کے باوجود بستر مرگ پر پڑی اپنی چھوٹی بیوہ بہن کی آخری بار ملنے کی خواہش پوری کرنے نا آتے۔ انہوں نے سب گلے شکوہ طاق پر رکھ کر بہن کے پیار کو ترجیح دی، میری گستاخیوں، نادانیوں کو بھول کر میرے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھ مرتی بہن کی خواہش کا احترام کیا۔

تیس سال بعد میں نے اسی شہر اسی گھر میں قدم رکھا تھا۔ اس عرصے میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ بچے جوان اور جوان بوڑھے ہو گئے تھے۔ میں بھی تو اب وہ نہیں رہا تھا۔ تیس سال پہلے چڑھتی جوانی کا جوش میری رگ رگ میں ٹاٹھیں مارتا تھا۔ چہرے کی سرخ رنگت، پہاڑوں کی تازہ آب وہوا کی دین تھی۔ جسمانی مشقت نے جسم کو سڈول بنا دیا تھا۔ پہاڑوں کی مضبوطی اور سادگی میری طبیعت میں رچی بسی تھی۔ ماموں کے اصرار پر کالج کی پڑھائی مکمل ہوتے ہی ان کے پاس شہر چلا آیا۔ ماموں کا اچھا خاص اسٹیل کا کاروبار تھا اور وہ چاہتے تھے کہ میں وہاں رہ کر کام بھی سیکھوں اور ان کا ہاتھ بھی بٹاؤں۔ ماموں کے تینوں بچوں میں سے سب سے زیادہ میری انل سے بنتی تھی جو عمر میں مجھ سے چار سال چھوٹا تھا۔ ارون اور شالنی اسکول جاتے تھے۔ اب اتنے عرصے بعد انہیں دیکھا تو ان کے ساتھ گزارے وہ دس مہینے یاد آ گئے۔ کیسے بے فکری کے مستی بھرے دن تھے۔ بھیا بھیا کرتے آگے پیچھے گھومتے تھے۔ ممانی بالکل ماں کی طرح خیال رکھتیں، کسے معلوم تھا کہ وقت ایسی چال چلے گا کہ ایک ہی پل میں چمکتے چاند کو گرہن لگ جائے گا۔ نزدیکیاں سالوں کی دوریوں میں بدل جائیں گی۔

موقع سوگواری کا تھا لہٰذا گرم جوشی سے کسی کے ملنے کی توقع نہ تھی۔ ممانی کو چھوڑ کر کسی نے سرد مہری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ساری رات کا سفر طے کرکے صبح گھر پہنچا تو ماموں کے آخری سفر کی تیاریاں چل رہی تھیں۔ وقت رخصت آخری دیدار کرتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے ایک بار پھر اپنی غلطیوں کی معافی مانگ کر اپنے ضمیر پر پڑے بوجھ کو ہلکا کرنے کی کوشش کی۔ آخری بار جب ماں کے انتقال پر ان سے ملاقات ہوئی تھی تو جاتے وقت ان کا رویہ نرم تھا۔ پورا ایک ہفتہ وہ ماں کے لئے رکے تھے۔ اس بیچ میری بیوی بچوں سے خوب گھل مل گئے تھے۔ میرا رتبہ، میری سنجیدہ ذمہ دارانہ شخصیت نے ان کا دل میری طرف سے صاف کر دیا تھا۔

ماموں کے آخری سفر کے وقت ایک ہجوم تھا جو انہیں ان کی منزل تک چھوڑنے چلا تھا۔ دو چار چہرے ہی شناسا نظر آئے۔ میری نظریں نہ جانے کیوں بے ارادہ قافلے میں شامل ہر شخص کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔ شاید انہیں بھی اسی کی تلاش تھی۔ ماموں کو سپرد آتش کر جب گھر لوٹے تو صرف قریبی رشتے دار ہی رہ گئے تھے۔ لمبے سفر کی تھکن اور سوگواری کے بوجھل پن سے جسم ٹوٹنے لگا تھا۔ گھر پہنچتے ہی نہا دھو کر سب کے ساتھ کھانے کی رسم نبھائی تو میری افسردہ حالت دیکھ کر انل مجھے اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لئے چھوڑ گیا۔ بستر پر گرتے ہی میری آنکھ لگ گئی۔ بھوک اور نیند بھی ایسی بے حیا اور بدلحاظ ہیں کہ نہ موقع دیکھتی ہیں نہ محل۔ جب گھنٹے بھر بعد آنکھ کھلی تو شام کے سائے پیر پھیلا چکے تھے۔ میں بھی اٹھ کر سب کے ساتھ صف ماتم پر جا بیٹھا۔ ممانی سے بات کرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے چپ کا روزہ نہیں توڑا۔ جھریوں بھرے چہرے پر سرد مہری چھائی رہی۔ ان کی بے رخی سے دم گھٹنے لگا تو میں اٹھ کر باہر کھلی ہوا میں آ گیا۔ جیب سے سگریٹ نکالی اور گھر سے نکلتے ہی اسے سلگا کر دھیرے دھیرے کش بھرتے ہوئے چہل قدمی کرنے لگا۔ ہوا میں مچلتی ہلکی سی خنکی نے طبیعت بہتر کر دی۔ ٹہلتے ٹہلتے خود بخود پچھلی گلی کی جانب مڑ گئے اور 'پاٹھک ولا' کے آگے جا کر تھم سے گئے۔ برآمدے میں ہلکی روشنی جل رہی تھی۔ بظاہر کوٹھی کا نقشہ بالکل نہیں بدلا تھا۔ بجلی کی طرح ایک پل میں گھر کے اندر کا نقشہ، اس کی آرائش میرے ذہن میں گھوم گئی۔ اپنے ہی حافظے پر تعجب ہوا۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اس کے نقوش میرے دل و دماغ پر زندہ جاوید ہیں۔ دروازے سے باہر برآمدے میں کسی کو آتے دیکھ میں تیز تیز قدم بھرتا گھر

کی جانب لوٹ آیا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے کہ انسان جتنا اپنے ماضی سے دور بھاگنا چاہتا ہے، اتنا ہی وہ اسے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اس رسا کشی میں اکثر حساس طبیعت لوگ ہار جاتے ہیں۔ میں بھی ہار گیا تھا۔ ماضی کے سائے میرے وجود سے لپٹتے جا رہے تھے اور میں لمحہ لمحہ کمزور پڑتا جا رہا تھا۔ رات کے سناٹے میں مجھے ان گزرے دنوں کی یادوں نے پھر گھیر لیا۔

تیس سال مجھے کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا کہ میرے چلے آنے کے بعد اس کا کیا ہوا ہوگا؟ کس حال میں ہے؟ کیسے زندگی بسر کی؟ زندہ بھی ہے یا نہیں؟ آج جنارے کے وقت شاید میری نظریں ان لوگوں کو ہی تلاش کر رہی تھیں۔ بہت قربت تھی دونوں خاندانوں میں۔ خوشی غمی میں ہمیشہ ساتھ۔ بے جھجک، بے وقت اک دوسرے کے گھر جا دھمکتے۔

ماموں کا دوست راجن پاٹھک منجھا ہوا کاروباری بندہ جس کی زندگی کا مقصد خوب پیسہ کمانا۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا، ان کی کل جائداد کا وارث۔ پہلی بار جب ان کے گھر گیا تو ان کی بیوی کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ دونوں کی عمر میں تقریباً ۲۰ رسال کا فرق رہا ہوگا جو پوری طرح واضح ہو رہا تھا۔ کہاں راجن بھیا، توند نکلی، ڈھیلا تھل تھل کرتا جسم اور کہاں تین بچے پیدا کرنے کے بعد بھی کنواری نظر آتی، تیکھے نین نقش، گھنے کالے بال، گندمی رنگ، غزالی آنکھیں، بھرا بھرا سینہ، لچکتی کمر تک جھولتی چوٹی، بڑی بیٹی کی عمر دس سال اور سب سے چھوٹا بیٹا چار سال کا۔

پہننے اوڑھنے کا سلیقہ، گھر سجانے سنوارنے کا ذوق، نفاست پسند، لذیذ پکوان بنانے میں ماہر، شاعری اور موسیقی کی شوقین، خوبصورت بھی خوب سیرت بھی۔ ہمیشہ خندہ پیشانی سے سب سے ملتی مگر تھی کم گو، بہت نپا تلا بولتی تھی۔ نہ جانے مجھے ایسا کیوں محسوس ہوا کہ ان کی آنکھیں بہت باتیں کرتی ہیں۔ پہلی ہی ملاقات میں ان کا گرویدہ ہو گیا۔

جیسے جیسے ان لوگوں سے رابطہ بڑھا، بے تکلفی بھی بڑھی اور جھجک غائب ہوتی گئی۔ گھنٹوں ان کے پاس بیٹھا رہتا، کام کرتی جاتی، میری باتیں دلچسپی سے سنتی جاتی، بہت کم بولنے والی حنا بھابی مجھ سے اکیلے میں ڈھیر ساری باتیں کرتی۔ اس وقت وہ الھڑ کمسن لڑکی

ایسا کیوں ہوتا ہے کہ انسان جتنا اپنے ماضی سے دور بھاگنا چاہتا ہے، اتنا ہی وہ اسے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اس رسا کشی میں اکثر حساس طبیعت لوگ ہار جاتے ہیں۔ میں بھی ہار گیا تھا۔ ماضی کے سائے میرے وجود سے لپٹتے جا رہے تھے اور میں لمحہ لمحہ کمزور پڑتا جا رہا تھا۔ رات کے سناٹے میں مجھے ان گزرے دنوں کی یادوں نے پھر گھیر لیا۔ تیس سال مجھے کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا کہ میرے چلے آنے کے بعد اس کا کیا ہوا ہوگا؟ کس حال میں ہے؟ کیسے زندگی بسر کی؟ زندہ بھی ہے یا نہیں؟ آج جنارے کے وقت شاید میری نظریں ان لوگوں کو ہی تلاش کر رہی تھیں۔ بہت قربت تھی دونوں خاندانوں میں۔ خوشی غمی میں ہمیشہ ساتھ۔ بے جھجک، بے وقت اک دوسرے کے گھر جا دھمکتے۔ ماموں کا دوست راجن پاٹھک منجھا ہوا کاروباری بندہ جس کی زندگی کا مقصد خوب پیسہ کمانا۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا، ان کی کل جائداد کا وارث۔

لگتیں۔ بے تکلفی کے باوجود اس راز سے پردہ ہٹانے میں ناکام رہا کہ اس بے میل شادی کی وجہ کیا تھی وہ کون سے حالات تھے کہ بیس سال کا فرق نظر انداز ہو گیا۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ سکتی تھی کہ 'کبھی کبھی بیٹیاں ماں باپ پر ایسا بوجھ بن جاتی ہیں جنہیں وہ جلد سے جلد کہیں بھی اتار دیتے ہیں۔ اس وقت عمر کا فرق کیا رنگ لائے گا، یہ بھی نہیں سوچتے'۔

'آدمی کی عمر نہیں جیب دیکھی جاتی ہے'، میں نے بھی سنی سنائی بات دہرا دی۔

طنزیہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھر گئی۔

'لوگ جھوٹ کہتے ہیں کہ آدمی بوڑھا نہیں ہوتا اور عورت کی جسمانی بھوک بچے جننے کے بعد مٹ جاتی ہے'۔ اس کی نیم آنکھوں میں خاموش شکایت مچل رہی تھی۔

اور کچھ تو نہ جان سکا پر اتنا ضرور سمجھ گیا تھا کہ انہوں نے بھی زندگی سے سمجھوتہ کیا ہے۔

رات بھر ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہا۔ صبح چھ بجے ہی انل نے ماموں کی استھیاں لے جانے کے لئے اٹھا دیا۔ چار پانچ قریبی رشتے دار شمشان گھاٹ کے لئے اس کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ چتا کی راکھ بجھ چکی تھی۔ کار جی نے دودھ کے چھینٹے مار کر راکھ ٹھنڈی کر کریدنی شروع کی اور اس میں سے ہڈیا چن چن کر مٹکے میں ڈال دیں جو ہم ساتھ لے کر گئے تھے۔ پھر استھیوں سے بھرے مٹکے کو سرخ کپڑے میں لپیٹ کر وہیں لا کر میں رکھ دیا۔ ماموں کا وجود سمٹ کر مٹکی میں سما گیا تھا۔ راکھ کو بوری میں ڈال کر شہر کے باہر ندی کے بہتے پانی میں بہا کر تین گھنٹے بعد لوٹ آئے۔

سارا دن انل کے ساتھ صف ماتم پر بیٹھ کر گزرا۔ جب ہم اکیلے ہوتے تو ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگتیں۔ اس نے تیس سالوں کا حساب لیا بھی اور دیا بھی۔ پھر اچانک اس نے پوچھ لیا۔

'آپ کا کبھی جانے کے بعد ان سے رابطہ ہوا؟'

میں نے دو منٹ اس کی طرف دیکھا تو نفی میں سر ہلا دیا۔

'پاٹھک صاحب نظر نہیں آئے؟' میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

'ہمارا ان سے رشتہ تبھی ختم ہو گیا تھا اور اب تو وہ اس دنیا میں ہے ہی نہیں۔ دو ماہ پہلے ہی چل بسے۔'

'اوہ! اور وہ؟'

'یہیں رہتی ہیں۔ بہو بیٹے کے ساتھ، کہیں آتی جاتی نہیں۔'

میں خاموش رہا۔ کہنے کو کچھ تھا بھی نہیں۔

شام ڈھلے میں سگریٹ پینے پھر گھر سے نکل گیا۔ اکیلا ہی ان گلیوں میں ٹہلتا رہا۔ دل میں ایک خواہش نے انگڑائی لی کہ ایک بار ماتم پرسی کے بہانے ہی اس سے مل کر آؤں۔ دیکھوں عمر نے کیا رنگ دکھایا ہے؟ کیا آج بھی وہ اتنی ہی دلکش، اتنی ہی حسین ہیں؟ مجھے آج بھی یاد ہے پہلے لمس کا وہ لطیف احساس جب انجانے میں میرا ہاتھ اس کے بدن کو چھو گیا تھا تو میرے پورے جسم میں برق سی لہرائی تھی۔ شاید اس طرف بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کا انگ انگ دعوت دیتا محسوس ہوا۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے اپنا وہم سمجھ کر جھٹک دیا تھا۔ پھر اس روز جب ان کے گھر گیا تو وہ نہانے گئی ہوئی تھیں۔ خادمہ نے مجھے ڈرائنگ روم میں انتظار کرنے کو کہا۔ میں رسالے پر نظریں دوڑا رہا تھا کہ پیچھے سے آ کر میری گردن میں بانہیں کچھ اس انداز سے ڈالیں کہ گیلے بالوں سے ٹپکتا پانی میرے کندھوں کو بھگونے لگا۔ اس کے دائیں گال سے میرا بایاں گال سٹا ہوا تھا۔ اس کی سانسوں کا سنگیت میرے کانوں میں طوفان بن کر سائیں سائیں کرنے لگا۔ اس کے جسم کی خوشبو میرے حواس پر چھا کر مجھے مدہوش کر گئی۔ یکلخت میں اٹھا اور پلٹ کر شعلہ بدن کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔ نہ وہ کسمسائی، نہ خود کو آزاد کرنے کی کوشش کی۔ اس کی خود سپردگی نے میرے حوصلے بڑھا دئے۔ آگ دونوں طرف برابر دہک رہی تھی۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ بھڑکتے ہوئے شعلے جب شانت ہوئے تو میں اپنے کئے پر شرمندہ تھا مگر اس کی نس نس میں سرشاری بھر گئی تھی۔ ایسے جیسے تشنہ روح جسم شرابور ہو گیا ہو۔ اس کی آنکھوں کی نرمی، اس کے لبوں کی مسکراہٹ، ایک ادھیڑ عمر کی عورت کی بلکہ ایک نوخیز کلی کی سی تھی۔ ان لمحوں نے عمر کے فاصلے مٹا دئے تھے۔ اس روز میرے لبوں کو چومتے ہوئے اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ 'تم نے میری ادھوری زندگی میں نئے رنگ بھر دئے ہیں۔ میرے جسم کی بھوک ہی نہیں میری روح کی پیاس بھی بجھی ہے۔'

پھر ایسے لمحے اکثر ہماری زندگی میں آنے لگے۔ وہ موقع تلاش کر مجھے بلا لیتی۔ میرے دل اور دماغ پر بھی اب اس کی حکمرانی تھی۔ پہلے وہ حنا بھابھی تھی اور پھر وہ صرف حنا تھی، میری حنا۔ محبت کا اعتراف پہلے اسی نے کیا تھا۔ سر تا پیر وہ محبت میں ڈوب گئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں خماری چھا جاتی جسے وہ بڑی ہوشیاری سے سب سے چھپا لیتی۔ شوہر کے سامنے اس کا روپ ہی الگ ہوتا۔ مجھے وہ اپنی حنا نہیں بیگانی بیگانی سی لگی۔ پہلی بار عورت کے تریا چرتر دیکھے۔ اس کا زندگی کا تجربہ مجھ سے زیادہ تھا۔ دس بہاریں مجھ سے زیادہ دیکھ چکی تھی۔ اسے دیکھ کر سمجھ میں آیا کہ عورت کتنی آسانی سے اپنے اصلی رنگ کو چھپا کر مکھوٹا لگائے ساری زندگی گزار سکتی ہے۔ میرے ساتھ ہوتی تو شوخ الہڑ کی طرح برتاؤ کرتی اور شوہر کے سامنے سمجھدار، ٹھہری، سنجیدہ، سیانی عورت، دیوانہ وار چاہنے لگی تھی۔ موقع ملتے ہی بے تحاشا پیار کی بوچھار کرنے لگتی۔ میں بنا سوچے سمجھے اندھی جوانی کے بے لگام گھوڑے دوڑاتا رہا۔ اکثر وہ لاڈ میں مجھ سے شکایت کرتی، 'تم بہت دیر بعد ملے ہو مجھے، کاش پہلے ملے ہوتے۔'

'کیسے ملتا؟ تمہیں تو اس دنیا میں آنے کی بہت جلدی تھی۔' میں ہنس کر جواب دیتا۔ ایسے ہی قربت کے لمحوں میں ایک روز اس کے دل میں چھپی خواہش اس کے لبوں تک آ گئی۔

'کاش میں تمہارے بچے کی ماں بن سکتی؟ آج افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے منے کی پیدائش کے بعد آپریشن کیوں کروایا۔'

اس کی بے لوث چاہت، اس کی خود سپردگی نے میرے اندر بھی حسد کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ میری کوشش ہوتی کہ میں اسے اس کے شوہر کے ساتھ نہ دیکھوں۔ ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھتے ہی میرے چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا مگر اس کا چہرہ پرسکون، لاتعلق رہتا جسے دیکھ کر میں اندر ہی اندر جل جاتا اور دل ہی دل میں راجن پاٹھک کو موٹا، بڈھا، کھوسٹ اور نہ جانے کیا کیا کہہ کر خود کو تسلی دیتا۔ آج سوچتا ہوں تو اپنی اس بچکانا حرکت پر ہنسی آتی ہے۔

میرے قدم ایک بار پھر پاٹھک ولا کے آگے آ کر تھم گئے۔ شام کے دھندلے سائے رات کی تاریکی میں بدل چکے تھے۔ کل دوپہر چوتھے کی رسم کے بعد میں اس شہر کو الوداع کہہ دوں گا۔ پھر نہ جانے کبھی ادھر آنا ہو یا نہ ہو۔ یہ خیال آتے ہی میرے قدم 'پاٹھک ولا' کے گیٹ کی جانب بڑھنے لگے۔ عقل نے وہیں سے پلٹ جانے کا مشورہ دیا تو ماضی کے چپکے سایوں نے آگے ڈھکیل دیا۔ بنا سوچے سمجھے میں نے گیٹ پر لگی بیل بجا دی۔ دو منٹ بعد ہی گیٹ پر ملازم وارد ہوا۔ اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی میں نے پوچھ لیا،

'مسز حنا پاٹھک گھر پر ہیں؟'

'آپ کون؟'

'انہیں بتائیے، رجت ملنا چاہتا ہے۔'

وہ مجھے اپنے ساتھ اندر لے گیا، ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ 'آپ بیٹھئے، میں اطلاع دیتا ہوں۔'

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی میری نظر دیوار پر لٹکی پاٹھک صاحب کی تصویر پر پڑی جس پر

تازہ لال گلاب کے پھولوں کا ہار لٹکا ہوا تھا۔ میں نے اپنی نظریں تصویر سے ہٹالیں۔ ان کی آنکھوں کی تاب لانا شاید آج بھی میرے لئے ممکن نہ تھا۔ ان سے نظریں ملانی تو میں نے بہت پہلے ہی چھوڑ دی تھیں۔ میری کوشش ہوتی کہ میرا ان سے سامنے ہی نہ ہو۔ اس منحوس دن وہ نہ جانے کیسے بے وقت گھر آ گئے اور ہمیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ مجھے دیکھتے ہی مجھ پر ٹوٹ پڑے، غصے سے چلانے لگے، گالیاں نکلنے لگیں، گھوسے برسنے لگے۔ حنا خود کو سنبھالتی ہوئی پھر ہم دونوں کے بیچ آ گئی۔ میری ڈھال بن کر ان کے سامنے کھڑی ہوگئی اور ان پر چلانے لگی،

'چھوڑ دو اسے، اس کا کوئی قصور نہیں، اسے میں نے بلایا تھا۔ جو بات کرنی ہے مجھ سے کرو۔'

'تم سے تو میں بعد میں نپٹوں گا، پہلے مجھے آستین کے سانپ سے نپٹ لینے دو۔' وہ پھر میری طرف بڑھے۔

حنا نے انہیں پیچھے ڈھکیلتے ہوئے مجھ سے کہا، 'رجت تم جاؤ یہاں سے، یہ ہمارا آپسی معاملہ ہے۔ ہم نپٹ لیں گے۔'

موقع غنیمت جانتے ہوئے میں وہاں سے جان بچا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ دیر رات تک میں اکیلا بے مقصد بھٹکتا رہا۔ گھر پہنچا تو میرا سامان دروازے پر ہی پڑا تھا۔ میری رسوائی کے قصے مجھ سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ ماموں ممانی نے ایسی جلی کٹی سنائی کہ میرا بس چلتا تو میں زمین میں دھنس جاتا۔ خاموشی سے سر جھکائے سنتا رہا۔ گھر کے دروازے مجھ پر ہمیشہ کے لئے بند ہوگئے تو میں شرمندگی کا بوجھ اٹھائے وہاں سے چلا آیا اور آج تیس سال بعد پھر اسی گھر میں کھڑا تھا جدھر سے جان بچا کر بھاگا تھا۔

قریب آتی قدموں کی آہٹ سن میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، بالکل بیس سال کے نوجوان کی طرح۔ گھبراہٹ سے پیشانی پر آئیں پسینے کی بوندوں کو صاف کیا۔ اگر اس نے پوچھلیا کہ اتنے سالوں بعد کیا کرنے آئے ہو؟ تو کیا جواب دوں گا۔ کیا کہوں گا کہ 'پاٹھک صاحب کا سن کر بڑا

> شام ڈھلے میں سگریٹ پینے پھر گھر سے نکل گیا۔ اکیلا ہی ان گلیوں میں ٹہلتا رہا۔ دل میں ایک کواہش نے انگڑائی لی کہ ایک بار ماتم پرسی کے بہانے ہی اس سے مل کر آؤں۔ دیکھوں عمر نے کیا رنگ دکھایا ہے؟ کیا آج بھی وہ اتنی ہی دلکش، اتنی ہی حسین ہیں؟ مجھے آج بھی یاد ہے پہلے لمس کا وہ لطیف احساس جب انجانے میں میرا ہاتھ اس کے بدن کو چھو گیا تھا تو میرے پورے جسم میں برق سی لہرائی تھی۔ شاید اس طرف بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کا انگ انگ دعوت دیتا محسوس ہوا۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے اپنا وہم سمجھ کر جھٹک دیا تھا۔ پھر اس روز جب ان کے گھر گیا تو وہ نہانے گئی ہوئی تھیں۔ خادمہ نے مجھے ڈرائنگ روم میں انتظار کرنے کو کہا۔ میں رسالے پر نظریں دوڑا رہا تھا کہ پیچھے سے آکر میری گردن میں بانہیں کچھ اس انداز سے ڈالیں کہ گیلے بالوں سے ٹپکتا پانی میرے کندھوں کو بھگونے لگا۔

افسوس ہوا' یا یہ پوچھنے آیا ہوں کہ میرے جانے کے بعد کیا ہوا؟ کس طرح تم نے اپنے شوہر کو راضی کیا؟ انہیں سوالوں میں الجھا ہوا تھا کہ اسے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ میری سانسیں تھم سی گئیں۔ گلاب کے پھول کی شوخ اور چنچل ڈالی کی جگہ خزاں رسیدہ ٹہنی میرے سامنے گم سم کھڑی تھی۔ اس کی اداس آنکھوں میں حیرت کے ساتھ نمی بھی ابھر آئی تھی۔ لب کچھ کہنے کو ہلے مگر آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ غیر ارادی طور پر اس کے قدم میری طرف اٹھنے لگے۔ ابھی میں یہ بھی طے نہیں کر پایا تھا کہ وہ میرے سامنے بیٹھ کر گفتگو کرے گی یا ہمیشہ کی مانند میرے قریب آکر مخصوص انداز میں میرا حال احوال دریافت کرے گی۔ اچانک اس کے بڑھتے قدم بے ربط ہوئے۔ اس نے دائیں ہاتھ کو سر کی جانب بڑھاتے ہوئے خود کو قائم رکھنے کی کوشش بھی کی۔ قبل اس کے کہ میں اس کی خیریت دریافت کروں، اس کا جسم سوکھے پتے کی طرح لرزتا میری بانہوں میں جھول گیا۔

میرے لئے یہ صورت حال کسی صدمے سے کم نہ تھی۔ میں چیخ چیخ کر گھر کے تمام افراد کو بلانا چاہتا تھا مگر جسم میں خون رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ابھی میں خود کو سنبھالنے کی کوشش میں تھا کہ ملازمہ پانی کی ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو ایک دم اس کی چیخ نکل گئی۔ اس کی چیخ سن کر حنا کا بیٹا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ دیکھتے ہی بولا،

'یہ کیا ہوا؟'

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی 'ماں، ماں' کہتے ہوئے میرے قریب آیا اور ماں کے سر اور گالوں کو سہلا کر زندگی کی رمق تلاش کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کی آواز مایوسی میں بدلنے لگی۔ پھر اس نے جھک کر حنا کو میری گرفت سے آزاد کراتے ہوئے دونوں ہاتھوں پر اٹھالیا اور اضطراری کیفیت میں کمرے سے نکل کر اندر کی جانب بڑھ گیا۔ میں سکتے کے عالم میں بت بنا وہیں کھڑا سب دیکھتا رہا۔ نوکر نے دوبارہ کمرے میں آکر جب سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا تو میں خاموش سر جھکائے سوچنے لگا کہ کھڑا ہوں، بیٹھوں یا چلا جاؤں۔

□□□

جاگتی آنکھوں کا سراب

اویناش امن
شیوچندر پتھ-۲، کالی مندر روڈ، ہنومان نگر، پٹنہ
موبائل: 7870678786

زندگی مجھ پر کئے گئے احسانوں کی قیمت اتنی جلد وصول کرلے گی اس کا اندیشہ مجھے دور دور تک نہ تھا۔ ہر طرح کی خوشیاں تھیں، میرے پاس کیا نہیں تھا؟ اچھا خاصا پھلتا پھولتا کاروبار، بیوی نہایت ہی حسین وجمیل بالکل دودھ سی سفید اور جن کی اطاعت گزاری مانو اس میں زعفران کی سی کیفیت پیدا کرتی تھی اور اس دودھ سے نکلی میری ۱۰ سالہ بیٹی رس گلے سی پھولی پھولی، نرم نرم بالکل خرگوش کے بچے سی۔ اس کے لمبے کمر تک جھولتے بال مجھ میں سحر پیدا کرتے۔ جب میں آفس سے دن بھر کی تھکان اوڑھے گھر آتا تو وہ ڈیڈی ڈیڈی کہہ کر سیدھے میری گود میں گر کر میرے پیٹ پر گھونسوں کی بارش کرنے لگتی اور میری ساری تکان یوں اتر جاتی مانو کاندھے سے ٹکا کوٹ۔ میں اپنی دنیا میں بہت خوش تھا اور زندگی کا ہر وقت شکریہ ادا کرتا۔ میری بیٹی سے عزیز مجھے دنیا میں کوئی بھی چیز نہ تھی۔ جتنی دیر وہ مجھ سے دور رہتی میں بے چین رہتا۔ دل کرتا میں ہر وقت اس کی کھلکھلاہٹ سنتا رہوں۔ صبح اسے میں خود اسکول کے لیے وداع کرتا۔ جب تک وہ اسکول میں رہتی تو تھوڑا صبر رہتا مگر جب وہ میری غیر حاضری میں اسکول سے آجاتی اور میں آفس میں رہتا تب مجھے بڑی کوفت ہوتی۔ عائشہ کہتی اے جی تم تو میرے لیے بھی اتنا بے چین نہیں ہوتے۔ میں ہنس کر کہتا کہاں ثنا اور کہاں تم؟ تم کسی حال میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی اور میں ہنس دیتا اور ساتھ میں وہ بھی۔ بیٹی کے لیے میرے اندر جنون کی حد تک محبت تھی۔ لیکن سکے کا کبھی ایک پہلو نہیں ہوتا۔ خوشی اور غم کی مقدار ہر فرد کے لیے طے ہوتی ہے اور ہر کسی کو اس سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ کسی کو خوشی پہلے ملتی ہے اور کسی کو بعد میں۔ اس وقت مجھے ذرا بھی احساس نہ تھا کہ عنقریب زندگی اپنے رنج کی سیاہ چادر میں مجھے اس طرح ڈھک لے گی جس سے نکلنے کے لیے میں تاعمر ہاتھ پاؤں مارتا رہ جاؤں گا۔

اس منحوس دن مجھے کال آئی، ''فوراً آیئے۔'' کال ثنا کے اسکول سے تھی۔ دل یکبارگی کسی انہونی کے اندیشے سے دہل اٹھا۔ ضروری میٹنگ چل رہی تھی۔ میں نے اپنی سکریٹری کو گاڑی لگوانے کا اشارہ کیا اور منیجر پر میٹنگ چھوڑ کر تیزی سے نکل گیا۔ سڑکیں قدریں خالی ہی تھیں چونکہ دوپہر کا وقت تھا خال خال کہیں ٹریفک نظر آتا تو بہت غصہ آتا۔ تیز چلو اور تیز، میں اسکول میں داخل ہوا۔ میرا کلیجہ لرز گیا۔ میں نے جو دیکھا اس کے سامنے میرا اندیشہ کہیں نہیں ٹھہرنے والا تھا۔ سامنے ثنا خون سے لت پت زمین پر پڑی تھی۔ اس کے سر کا ایک حصہ اڑ چکا تھا اور دماغ کے حصے دور جا کر بکھر گئے تھے۔ اے خدا..... میرا دل بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں کی بصیرت تو نے کیوں نہیں چھین لی یہ دیکھنے سے پہلے؟ راستے میں میری کار کو کسی ہائیوا سے کچلوا کیوں نہیں دیا۔ کاش میرے پرزے بکھیر دیئے ہوتے۔ مجھے اسکول تک پہنچنے کیوں دیا اے خدا! میں وہیں گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

کمینوں دیکھ کیا رہے ہو فوراً لے چلو میری بیٹی کو ہسپتال۔ پورا اسکول میرے گرد جمع تھا مگر کسی کی ہمت نہیں تھی کہ میرے قریب آئے۔ میں نے ثنا کو چھوا وہ اب بھی رس گلے جیسی تھی، نرم نرم بالکل خرگوش کے بچے کی طرح، میرے آنسوؤں نے میرے رس گلے کو نمکین کر دیا تھا۔ اس کی کمر کو چھوتے گھنگھرالے بال ہوا سے کبھی اڑا اڑ جاتے۔ مجھے لگ رہا تھا ابھی میری ثنا اٹھے گی اور میری گود میں بیٹھ کر تابڑتوڑ گھونسے برسانا شروع کردے گی۔

میرے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔

''— سراب کچھ نہیں ہوسکتا بے بی جی کا بھیجا چور ہوگیا ہے۔''

''— دور ہٹو میں چلایا۔'' میرا ڈرائیور سہم کر ایک طرف ہوگیا۔

''کیسے ہوا؟ کس نے کیا؟'' میں گرجا۔

پورے اسکول میں آدھی رات کے مرگھٹ سی خاموشی تھی۔

کچھ وقفے کے بعد اسکول کا پرنسپل کانپتا ہوا سامنے آیا۔ مارے خوف کے اس کے منہ سے الفاظ ادا نہیں ہو رہے تھے۔ پھر اپنی ساری ہمت جمع کر کے وہ بولا—

''— سر، اسکول کی گاڑی بیک ہو رہی تھی۔ فرسٹ شفٹ ختم ہوا تھا۔ لنچ بریک تھا۔ بچی ہاکی کھیلتے ہوئے کب بس کے پیچھے..... میں نے دیکھا کچھ دوری پر ایک ہاکی اسٹیک پڑا تھا۔ میں نے اٹھ کر ہاکی اسٹیک اٹھائی اور ایک زوردار وار پرنسپل کے سر پر کیا۔

وہ وہیں غش کھا کر گر پڑا۔

اب تک اسپتال والے آ گئے تھے۔ دو لوگوں نے اسے اٹھا کر اسٹریچر پر رکھا۔ ایک نے دستانے والے ہاتھوں سے اس کے جسم کے ٹکڑے اٹھائے اور انہیں ایک پیکیٹ میں ڈال کر سیل کر دیا۔ میں بدحواس تھا۔ زندگی یہ تو نے مجھے کیا دکھا دیا؟ کیا اس دن کے لیے اپنی خوشیوں کی گرماہٹ میں لپیٹ رکھا تھا؟ اگر اس وقت میرا پستول ساتھ ہوتا تو میں خود کو گولی مار لیتا۔

ثنا چلی گئی اور میری تمام خوشیاں، مسکراہٹ اپنی باربی والی ٹرالی بیگ میں پیک کر کے لے گئی جسے وہ کسی سفر پر جانے سے پہلے خود اپنے ہاتھوں سے پیک کرتی اور اس میں میرا بھی کوئی نہ کوئی کپڑا ضرور رکھتی۔ میں پوچھتا تو بڑے بھولے پن سے کہتی۔ ''میرے کپڑوں سے میرے ڈیڈی کے کپڑوں کی خوشبو الگ نہیں ہونی چاہئے۔''

اب ثنا نہیں تھی تو گھر کا ہر کونا کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ اس گھر میں ہر جگہ اس کی یادیں بسی تھیں۔ لگتا ابھی ادھر سے وہ نکل آئے گی اور میرے پیٹ پر گھونسوں کی بارش کرنا شروع کر دے گی..... مجھے اس کے کمرے میں جانے کی ہمت نہ تھی۔ میں نے اس کا کمرہ بند کروا دیا۔ لیکن یہ مجھے اس کی یادوں سے دور نہ کر سکا۔ میں نے گھر بدلنے کا فیصلہ کر لیا اور شہر کی ہلچل اور بھاگ دوڑ سے دور سمندر کے کنارے ایک گھر خرید لیا۔ اب میں آفس بہت ہی کم جاتا تھا اور اکثر لان میں بیٹھا آتی جاتی لہروں کو دیکھتا رہتا۔ دل کرتا کسی روز کوئی لہر سونامی کی طرح اٹھے اور مجھے بہا لے جائے، جس سے مجھے اس کرب ناک زندگی سے آزادی ملے۔ ثنا کے بغیر زندگی میرے لیے کتنی مشکل تھی!

ایک دو دفعہ عائشہ نے مجھ سے کہا بھی کہ ہماری ابھی عمر کچھ زیادہ نہیں ہوئی ہے۔ ہم چاہیں تو ایک بچے کے لیے کوشش کر سکتے ہیں۔ تب میں نے عائشہ کو جھڑک دیا تھا۔

''— ثنا کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔''

پھر عائشہ نے اس سلسلے میں کبھی بات نہیں کی۔ وہ جب میرے سامنے رہتی تو اپنے چہرے پر شکن نہ آنے دیتی۔ میں اس کا درد سمجھ تو سکتا تھا مگر ہائے افسوس، میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ثنا کے حصار سے نکلنا میرے لیے کسی طور ممکن نہ تھا۔ بزنس اب بہت حد تک منیجروں کے بھروسے ہی چل رہا تھا اس لیے اس میں اب پہلے والی بات نہیں رہ گئی تھی لیکن کچھ کرنے کی، دولت جمع کرنے کی ترقی کرنے کی، میری تمام خواہشیں مر چکی تھیں۔ میں ثناء کی یادوں کے ساتھ

> اب ثنا نہیں تھی تو گھر کا ہر کونا کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ اس گھر میں ہر جگہ اس کی یادیں بسی تھیں۔ لگتا ابھی ادھر سے وہ نکل آئے گی اور میرے پیٹ پر گھونسوں کی بارش کرنا شروع کر دے گی..... مجھے اس کے کمرے میں جانے کی ہمت نہ تھی۔ میں نے اس کا کمرہ بند کروا دیا۔ لیکن یہ مجھے اس کی یادوں سے دور نہ کر سکا۔ میں نے گھر بدلنے کا فیصلہ کر لیا اور شہر کی ہلچل اور بھاگ دوڑ سے دور سمندر کے کنارے ایک گھر خرید لیا۔ اب میں آفس بہت ہی کم جاتا تھا اور اکثر لان میں بیٹھا آتی جاتی لہروں کو دیکھتا رہتا۔

اپنے دل کے نہاں خانے میں مقید ہو کر رہ گیا تھا۔

وقت لہروں کا وہ تھپیڑا ہے جو اپنے ساتھ کنارے کی ہر چیز بہا لے جاتا ہے۔ مگر میں کنارے پر جمی وہ چٹان تھا جو وقت کے تھپیڑوں سے بے اثر تھا۔ وقت کی لہریں بدستور اس طرح آتی جاتی رہیں اور دس سال بھی گزر گئے مجھے کچھ پتا بھی نہ چلا۔ میرے لیے ثنا کی موت کے بعد زندگی گویا وہیں منجمد ہو کر رہ گئی تھی لیکن اسے پگھلانے والی تمازت کا سفر اب مکمل ہو چلا تھا اور مجھے اس کی ذرا بھی خبر نہ تھی۔

ایک شام میں حسب معمول لان میں بیٹھا کافی پیتے ہوئے آتی جاتی لہروں کو دیکھ رہا تھا کہ ایک گیند میرے کافی مگ کو ہاتھ سے گراتے ہوئے میرے پاؤں سے کچھ دور جا کر ٹھہر گئی۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ کافی کا کچھ حصہ میز کے ساتھ ساتھ میرے کپڑوں پر بھی پھیل گیا تھا۔ گیٹ کے باہر سے آوازیں آ رہی تھیں۔

.....جاؤ، بال لے کر آؤ.....تم ہی جاؤ نا.....

میں کیوں جاؤں؟ تم نے ماری ہے تو تم جاؤ وغیرہ وغیرہ۔

میں ابھی استعجاب کی کیفیت سے نکلا نہ تھا کہ ایک نہایت ہی سریلی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی—

.....انکل مے آئی کم اِن؟

.....کون ہے؟ آ جاؤ۔

اور اس کے ساتھ ہی ثنا گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ وہ دھیرے دھیرے سہمے قدموں سے اندر داخل ہوئی۔ اس نے میری طرف نظریں اٹھائیں پھر میرے کپڑوں پر پڑے کافی کی چھینٹیں اور میز پر اوندھے پڑے کافی مگ کو دیکھا۔ شاید اسے مجھ سے کچھ ڈانٹ ڈپٹ کی امید تھی مگر میں تو دوسرے ہی جہان میں تھا۔ میرا کوئی ردعمل نہ دیکھ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور گیند اٹھا کر تیزی سے نکل گئی۔ میں بت بنا کھڑا رہا۔ میری زبان سے ایک لفظ بھی جاری نہ ہو سکا۔ وہ جب تھینک یو کہہ کر گیٹ سے باہر نکل گئی تب مجھے ہوش آیا۔

یقیناً وہ ثنا نہیں تھی مگر مجھے نہ جانے کیوں اس میں میری ثنا نظر آئی۔ وہی دس سال کی رس گلے جیسی پھولی پھولی، خرگوش کے بچے جیسی نرم، کمر تک جھولتے گھنگھرالے بال۔ میں تیزی سے باہر کی جانب لپکا۔ بیچ کے کنارے بہت سے بچے کھیل رہے تھے۔ کچھ

کرکٹ، کچھ والی بال کو کچھ ریت کے گھروندے بنانے میں مصروف تھے۔ مرد عورتوں میں سے زیادہ تر لیٹ کر سن باتھ کا مزہ لے رہے تھے۔ سمندر کا کنارہ ہمیشہ کی طرح سیلانیوں سے بھرا تھا۔ یہاں بھی زندگی کئی سطحوں پر متحرک تھی پر میری نگاہیں ثنا کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ مجھے نہیں معلوم یہ کون سا جذبہ تھا جو مجھ سے یہ سب کروا رہا تھا۔ میرا ذہن بضد تھا کہ وہ ثنا نہیں ہے مگر دل اسے ہرگز ماننے کو تیار نہیں تھا۔

سمندر کنارے روز سیکڑوں سیلانی آتے تھے۔ کیا معلوم یہ انہیں میں سے کوئی ہو جو اپنے ماں باپ کے ساتھ گھومنے آئی ہو اور شام ہوتے یہاں سے چلی جائے دیگر سیلانیوں کی طرح۔

میں نے بیچ کا کونا کونا تلاش کر لیا مگر وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ اس کشمکش میں مجھے ذرا بھی خیال نہیں رہا کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ یہیں رہتی ہو میری طرح میرے پڑوس میں۔

انسانی تخیل بھی عجیب شئے ہے کبھی کبھی تو سورج کے بھی پاس چلا جاتا ہے اور کبھی اپنے آس پاس کی چیزوں کو دیکھنے سے بھی قاصر ہو جاتا ہے۔

ثنا میرے بالکل قریب آ گئی تھی۔ میرے بغل کا برسوں سے خالی پڑا بنگلہ کب آباد ہو گیا تھا یہ بھی مجھے پتا نہیں چل سکا تھا۔ میں ہر چند کوشش میں تھا کہ ثنا کی یادیں میرے دل میں مدھم پڑ جائیں اور زندگی تھی کہ اسے دن بہ دن آنچ دئے جاتی تھی اور اب اس بچی نے میرے قلب کو شعلہ بار کر دیا تھا۔ دل کسی طور پر ماننے کو تیار نہ تھا کہ وہ ثنا نہیں ہے۔

میں ناکام اداس قدموں سے واپس لوٹ گیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ مجھے لگا کہ نہیں یہ میرا وہم تو نہیں؟ ایسا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ آخر کار جب تک میں اپنے دل کو اس حقیقت کو وہم ماننے کے لیے تیار کر پاتا کہ ایک صبح جب میں واک سے لوٹ رہا تھا میں نے دیکھا میرے گھر کے سامنے سے ایک اسکول بس مڑی اس کے بغل میں ثنا کھڑی تھی۔

ثناء بیٹی!

۱۰ سال پرانے واقعات کسی فلم کی ریل کی طرح میری نظروں کے سامنے گھوم گئے میں چلاتا ہوا دوڑا اور اسے ایک جھٹکے سے کھینچ لیا۔ یکا یک مجھے ایسا کرتا دیکھ بس ڈرائیور بھی ہڑبڑا گیا اور وہ جہاں تھا وہیں

میں نے پتا کیا تو معلوم ہوا بغل والا بنگلہ کسی این آر آئی بزنس مین نے خرید لیا ہے۔ وہ اور اس کی فیملی سال کے اخیر تک اس میں رہنے کو آنے والی ہے۔ بنگلے کی مرمت اور ڈیکوریشن کے لیے اس نے ایک منیجر کم کیرٹیکر بحال کر دیا ہے جو اپنی فیملی کے ساتھ وہیں رہتا ہے۔ یہ پارول اس کی بیٹی ہے۔
میری ساری توجہ اس بنگلے پر جا ٹکی تھی۔ اور آخر ایسا کیوں نہ ہوتا۔ وہ میری ثنا کا گھر تھا جو پارول کی شکل میں میرے پاس آئی تھی۔ میں نے خود کو بہت روکا لیکن ایک دن میرے قدم اس بنگلے کی طرف بڑھ ہی گئے۔ بنگلے کے رنگ و روغن کا کام چل رہا تھا۔ جگہ جگہ پینٹ کے ڈبے، استعمال کیے ہوئے برش بکھرے تھے۔ بنگلے پر لٹکتے ہوئے جھولوں سے مزدور ایک طرف گھسائی کر رہے تھے تو دوسری طرف پینٹ کا کام ہو رہا تھا۔

اس نے بریک لگا دئے۔ ثنا کی بغل میں ایک عورت کھڑی تھی غالباً اس کی ماں۔ ہر چیز یکا یک رک گئی تھی۔ پھر خاموشی ٹوٹی۔

کیا ہوا انکل؟ یہ کیا کیا آپ نے اور آپ مجھے ثنا کیوں کہہ رہے ہیں؟ میں پارول ہوں۔

میں نے نظریں اٹھا کر اردگرد دیکھا۔ پارول، اس کی ماں، بس کے بچے، ڈرائیور، میرا گارڈ سبھی مجھے حیرت ناک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ میں تھوڑا سنبھلا۔

— آئی ایم سوری۔ میں نے اپنے چشمے کو تھوڑا اٹھا کر اپنی انگلی کے پوروں کو آنکھوں پر پھیرا اور گھر آ گیا۔

پارول بس میں بیٹھ کر اسکول چلی گئی۔

میں نے پتا کیا تو معلوم ہوا بغل والا بنگلہ کسی این آر آئی بزنس مین نے خرید لیا ہے۔ وہ اور اس کی فیملی سال کے اخیر تک اس میں رہنے کو آنے والی ہے۔ بنگلے کی مرمت اور ڈیکوریشن کے لیے اس نے ایک منیجر کم کیرٹیکر بحال کر دیا ہے جو اپنی فیملی کے ساتھ وہیں رہتا ہے۔ یہ پارول اس کی بیٹی ہے۔

میری ساری توجہ اس بنگلے پر جا ٹکی تھی اور آخر ایسا کیوں نہ ہوتا۔ وہ میری ثنا کا گھر تھا جو پارول کی شکل میں میرے پاس آئی تھی۔ میں نے خود کو بہت روکا لیکن ایک دن میرے قدم اس بنگلے کی طرف بڑھ ہی گئے۔ بنگلے کے رنگ و روغن کا کام چل رہا تھا۔ جگہ جگہ پینٹ کے ڈبے، استعمال کیے ہوئے برش بکھرے تھے۔ بنگلے پر لٹکتے ہوئے جھولوں سے مزدور ایک طرف گھسائی کر رہے تھے تو دوسری طرف پینٹ کا کام ہو رہا تھا۔ پورا احاطہ سیمنٹ کی دھول اور پینٹ کی بدبو سے اٹا پڑا تھا۔ بنگلے کے لان سے سٹے ایک کنارے پر آورت ہاؤس تھا جس میں پارول اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھی۔ پارول کی ماں باہر ہی کھڑی تھی مجھے دیکھتے ہی پہچان گئی۔

— آپ؟

تب تک مجھے دیکھ اس کا باپ بھی باہر نکل آیا۔ سیمنٹ اڑنے سے مجھے تھوڑی چھینک سی آئی۔ اس کا باپ جو مجھے پہلے سے پہچانتا تھا اس نے نہایت عاجزی کے ساتھ مجھے کمرے کے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ پارول کی ماں سمٹی سی ایک کونے میں کھڑی رہی۔

— وہ میں اس روز کے لیے.....

— جانے دیجئے سر۔ اس کا باپ تپاک سے بیچ میں بول پڑا۔ نہ جانے کیوں وہ اس روز کے واقعہ کو طول نہیں دینا چاہتا تھا لیکن واقعہ سے اس کی آگہی اس بات کا انکشاف کر رہی تھی کہ بات وہیں ختم نہیں ہوئی تھی۔ شاید یہ میرے ایک بڑے اور مشہور بزنس مین ہونے کا ایک رعب سا تھا جو اسے کچھ بھی کھل کر بولنے نہیں دے رہا تھا اور میری خواہش تھی کہ بات نکلے۔ میں نے کمرے میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ میری نظریں جسے ڈھونڈ رہی تھیں اس کا کوئی سراغ نہ تھا۔ تھوڑی دیر ہم خاموش رہے آخر ہچکچاتے ہوئے میں نے پوچھ ہی لیا—

— بچی نظر نہیں آ رہی؟

— جی وہ اسکول گئی ہے۔ پارول کی ماں نے کہا۔

میں نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی ۱۲ بجے تھے۔ یہی وہ وقت تھا جب.....

میں نے اشارے سے سکریٹری کو بلایا جو پہلے سے ایک بڑا کیری بیگ لے کر تیار تھا۔

— یہ کچھ کھلونے اور چاکلیٹ پارول کے لیے۔

— اس کی کیا ضرورت تھی؟ اس کی ماں کیری بیگ لیتے ہوئے تھوڑا ہچکچائی کہ اس کا باپ بیچ میں آ گیا۔

— رکھ لو سر دے رہے ہیں۔ وہ آہستہ سے بولا پھر میری طرف گھوم کر مسکرا دیا۔

پھر میں نکل گیا۔ پارول کو نہ دیکھ پانے کا افسوس تھا۔ دل نے کہا میں نے اس غلط وقت کا انتخاب کیوں کیا؟ جانے سے پہلے گھڑی تو دیکھ لیتا..... آج کا دن خالی گیا۔

میں بھاری دل سے گھر لوٹ آیا۔

شام کے وقت میں روز کی طرح لان میں بیٹھا کافی پی رہا تھا کہ پارول نمودار ہوئی۔

سفید فراک میں خرگوش کے بچے سی بالکل ثناء جیسی۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی میرے پاس آئی اور کچھ دوری پر کھڑی ہوگئی۔ میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ سکڑی سی نظریں نیچی کر بیٹھ گئی۔

— وہ، پاپا نے کہا کہ انکل نے اتنے سارے کھلونے اور چاکلیٹس دئے ہیں تو جا کر انہیں تھینکس بول کر آؤ..... اس لیے تھینک یو۔ اس نے بڑی معصومیت سے کہا میں اسے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا—

— انکل اب میں جاؤں۔ اس جملے نے میرے خیالوں کا تار توڑا۔

— ایسے نہیں..... جون.....!

جون فوراً بھاگ کر آئیس کریم کا ایک باؤل اور چاکلیٹ شیک لے کر آیا۔

ثناء کو آئیس کریم اور چاکلیٹ شیک بہت پسند تھا۔

پارول نے بغیر کسی حیلہ حوالے کے دونوں چیزیں ختم کر دیں جب اس نے شیک پی لیا تو اس کے لبوں کے اوپر بھورے چاکلیٹی رنگ کی ایک لکیر بن گئی جسے دل نے چاہا کہ میں ہاتھوں سے صاف کر دوں لیکن میرے ہاتھ نہ بڑھ سکے۔

فارغ ہو کر اس نے مجھ سے پوچھا—

— تو کیا میں اب جاؤں انکل؟

— ٹھیک ہے پھر آنا پارول۔

— او کے انکل بائے۔

— بائے بیٹا۔

اب میری زندگی کی بہاریں دھیرے دھیرے لوٹنے لگی تھیں۔ عائشہ سے پارول کی دوستی ہوگئی تھی۔ اسے بھی پارول اچھی لگنے لگی تھی۔ اب اکثر پارول عائشہ سے ملنے چلی آتی۔ اب اس کا وجود رفتہ رفتہ میرے بنگلے کو سرشار کرنے لگا تھا۔ آتی جاتی لہروں کی نحوست اب موسیقی میں تبدیل ہونے لگی تھی لیکن یہ بھی زیادہ دن تک چلنے والا نہ تھا۔ ایک روز صبح میں اخبار پڑھتے ہوئے چائے پی رہا تھا۔ میری نیم خوابیدہ آنکھیں مشقت کے ساتھ اخبار کے صفحوں پر لڑکھڑاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔ صبح صبح ہلکی دھند چھائی تھی۔ یکا یک دھند کو چیرتے ہوئے میری ثنا آتی نظر آئی۔ میں دم بخود ہوگیا۔ میرے قدم خود بخود آگے بڑھے۔ ثناء کے قریب پہنچ کر میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور ثناء کی پیشانی کو چوم لیا۔

— چھی گندے آدمی۔ پارول کے دھکے سے خوابوں کا طلسم ٹوٹا۔ میرے سامنے پارول کھڑی تھی۔ لیکن اب وہ صرف پارول تھی۔ اس میں ثناء کی معصومیت اور بھولا پن کہیں سے نہیں تھا۔ یکا یک اس کی شبیہ معدوم ہوگئی تھی۔

پاؤں پٹختی پارول کو میں نے دوڑ کر پکڑا۔

— دیکھو پارول مجھے غلط مت سمجھو۔ تم میری بیٹی جیسی ہو۔ بیٹی مانتا ہوں میں تمہیں۔ میں کس کر پارول کو پکڑے ہوئے تھا اور وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

— تم پارول، میری بیٹی جیسی ہو ثنا جیسی۔ میری زبان خشک ہو رہی تھی۔

میں خوب سمجھتی ہوں۔ یہ سب بہانے مجھے پہلے ہی سمجھ لینے چاہئے تھے۔ آپ گندے ہیں گندے۔ آپ..... بینڈ..... ہے۔ وہ چلی گئی۔

میں بت بنا کچھ دیر وہیں کھڑا رہ گیا۔ دس سالوں میں کتنا کچھ بدل گیا۔ اب ثناء نہیں آئے گی کبھی نہیں۔ میں کسی مجرم کی طرح میز کی طرف بڑھا کہ تبھی ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور اخبار کے صفحے ہوا میں ادھر ادھر بکھر گئے۔ ایک صفحہ ٹھیک میرے پیر کے پاس آ کر گرا میں اسے اٹھانے کے لیے جھکا کہ میری نظر ایک ہیڈ لائن پر گئی۔ ''پچاس سالہ درندے نے دس سال کی معصوم کے ساتھ.....''

میں وہیں مفلوج ہوگیا۔

□□□

حوادث غائبانہ

راجیو پرکاش ساحر
20/84، رنگ روڈ، اندرا نگر، لکھنؤ
موبائل: 9839463095

پر یدرنگ جزیرہ دلدلی صحرائی دھند کی پردہ پوشی میں، سمندر کی لافانی لامحدودیت کے کسی انجان گوشے میں خاموش سسک رہا تھا۔ سمندری خراشوں سے خراشیدہ جزیرے کو سمندری اُتار چڑھاؤ کھارے پن سے تر بہ تر کیے رہتے تھے۔ جس کی قید میں جزیرے کی آب و ہوا تھم سی گئی تھی۔ جزیرے کے چاروں طرف سمندر گہرا نیلا ساکت تھا۔ آسمان پر نہ چاند، نہ ستارے اور نہ چاندنی ہی تھی۔ بس تاریکیاں ہی تاریکیاں تھیں۔

ڈاکٹر جواگو نے اگرچہ جنگ کی حیوانیت قریب سے دیکھی تھی تو وہ عشق کی روہانیت سے بھی سرشار ہوا تھا۔ مگر اب حالات کچھ ایسے ہوگئے تھے کی وہ اپنی اشتیاقی کیفیت سے ہر حال اُبر آنا چاہتا تھا۔ سیاہ مرکزی نقطہ کی خوفناک شرارتیں اسے مضطرب کر رہی تھیں۔

سیاہ مرکزی نقطہ لمحہ بہ لمحہ روپ بدل رہا تھا۔ ڈاکٹر جواگو کی بھوک پیاس، دن کا چین، اور راتوں کی نیند نہ جانے کہاں غائب ہوگئی تھی۔ تاریک مادے اور تاریک توانائی کا ذرّہ سیاہ مرکزی نقطہ آئے دن زندگیوں کو بے نور کر رہا تھا۔ ڈاکٹر جواگو سیاہ مرکزی نقطہ کی چال بازیاں کچھ کچھ سمجھ رہا تھا اور اسی لیے سیاہ مرکزی نقطہ کے ساتھ تو چھُپ میں آتا ہوں، بے انتہا تھکن کے باوجود کھیل رہا تھا کیونکہ بہت سے دلوں کا دھڑکنا اسی کھیل کے بھروسہ تھا۔ بہت سے خدشات اس کی راہ دیکھ رہے تھے۔ اُن میں سے ایک سیاہ مرکزی نقطہ کا آقا بھی تھا۔ دلدلی جزیرے کے درخت آسیب زدہ شباہت اختیار کیے ہوئے تھے۔ جزیرے میں سب کچھ مبہم تھا، کچھ بھی صاف نہیں تھا۔

وہ اس ویران جزیرے میں تنہا تھی اور ایک قدیم مگر تناور درخت کے سائے میں سمٹی ہوئی تھی۔ اداس، بے بس اور حیران۔ قسم قسم کے رنگین ہنگاموں نے اس کے بادبان کو تار تار کر دیا تھا۔ مگر یہ سب تو جسے کل کی باتیں تھیں اور آج وہ اس یک رنگی جزیرے میں تنہا قید تھی۔ دلدل خزاں رسیدہ، شجر اور فضا اداس، جو سامنے تھا اس سے تصور ہوا اداس۔ کچھ عکس ہولناک وہاں رینگنے لگے، ہر رُخ سے اس کو آئینہ لگا اداس، بربادیوں سے شہر کے ذرّے تھے مضطرب، عادت تھی جس کو ظلم کی، ہوگا وہ کیوں اداس۔ راسپوٹین اداس ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔ گہری نیلی بھوری مایوس کن فضا میں اس کی دردناک صدا صرف راسپوٹین سن رہا تھا۔ اور وہ منتظر تھی اس کے اگلے حکم کی۔ ریگزاروں کا طواف کرتی راسپوٹین کی خشک آواز اس کی رگوں میں خوں کو خشک کر دیتی تھی۔ جسے ہزاروں سال پرانا مردا جسم شعبدہ گری پہ اُتر آیا ہو۔ وہ مجبور تھی، مجبور وہ جزیرے پر بھی تھی اور مجبور وہ درو دیوار کے قفس میں بھی تھی۔

'سبقت حاصل کرنا بے حد ضروری ہے۔ ثابت کرو خود کو'

بے ہمگی کے کبودی عالم میں گُل افشاں گُلشن میں کوئی کیوں نہیں رہ سکتا۔ راسپوٹین نے لڑکی کو پہلے شمشان بھیجا تھا۔ اس لڑکی کا نام راسپوٹین نے لکشمی رکھ دیا تھا۔ اسی دوران ایک اور لڑکی غائب ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر جواگو پر دباؤ بڑھ رہا تھا۔ تاریک توانائی کے دھماکوں سے طاقت حاصل کرنے والا سیاہ مرکزی نقطہ جس بلیک ہول سے آتا ہے وہ کہاں ہے؟ ڈارک میٹر کی مایا نگری کا نادر شاہی سلطان کون ہے؟ ڈاکٹر جواگو کے پاس وقت کم تھا۔

اس رات موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ شمشان گھاٹ میں جگہ جگہ پانی بھر گیا تھا۔ ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ تھی۔ چتا کی لکڑیاں بھیگ چکی تھیں۔ اور لاشیں ادھ جلی ہی رہ گئی تھیں۔ مگر ارتھیوں کے آنے کا سلسلہ جاری تھا۔ چانڈالوں کو دم بھرنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ موت اٹل ہے، ٹل نہیں سکتی۔ تانتریک کی سرخ آنکھیں لکشمی کو گھور رہی تھیں۔ کالج کے جونیئر سیکشن سے ابھیمنیوں کی خوں آلودہ لاش مرگھٹ آئی ہے۔ توڑو لکشمی توڑو، چکرویوہ کا آخری چکر توڑو وہاں! ساتواں چکر، کیونکہ اسی کے بعد آزادی ہے۔ کنس دیوکی کی نو مولود اولادوں کو زندان میں قتل کر رہا ہے۔ اشوتھ تھا مانسل در نسل نسلوں کو قتل کرتا آرہا ہے۔ سب کچھ جس کا تس ہی تو ہے۔

پاپا نے جان کیوں دی؟ ماں کو کیوں مار ڈالا؟ کوئی جان کیوں دیتا ہے؟ کوئی جان کیوں لیتا ہے؟ جان لینے دینے کا سلسلہ کب ختم ہوگا؟ جان پہ حق انسان کا ہے یا خدا کا؟

خواہشیں، شکست کا خوف، راسپوٹین کا لہجہ

طنزیہ تھا۔لکشمی ہو یارضیہ کوئی فرق نہیں پڑتا۔دونوں کے مسائل قریب قریب ایک جیسے ہیں اور دونوں کی کشمکش بھی قریب قریب ایک جیسی ہی ہے۔چار دیواری،شادی،عشق یا پرواز بہت اُلجھنیں ہیں۔راسپوٹین دھرم اور مذہب کا خوب خوب خیال رکھتا ہے۔اب اگر راسپوٹین نہیں رکھے گا تو اور کون رکھے گا؟

راسپوٹین نے اس کا نام رضیہ رکھ کر اس کو قبرستان بھیجا تھا۔قبرستان سرد خاموشی میں بھیگ رہا تھا۔جاڑوں کی برسات میں قبرستان اندھیاروں میں ڈوبا ہوا تھا۔رضیہ نے چاروں طرف نظر اُٹھا کر دیکھا،کالی رات میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔آسماں میں رہ رہ کر بجلی چمک رہی تھی۔یکا یک بجلی کوندی پل بھر کے لیے کچھ نظر آیا،شاید گورکن قبر خود رہا تھا۔راسپوٹین نے کہا تھا،کفن دفن کا کاروبار ہے، چلتا ہی رہے گا۔تم اصغر کے گلے میں لگا تیر کیا نکال پاؤ گی؟ صدیاں بیت گئیں لیکن تیرا ابھی بھی اصغر کے گلے میں لگا ہوا ہے۔نونہالوں کی لاشیں کتے نوچ رہے ہیں۔رضیہ تنہا تھی اور ڈری ہوئی تھی۔

موت کے ویڈیو وائرل ہو رہے تھے۔ڈاکٹر جواگو کو خبر ملی تھی کی راسپوٹین نے کئی ڈارک گروپ بنالیے ہیں اور وہیں سے لنک آرہے ہیں۔راسپوٹین کا میسج ہے :ڈر کے آگے جیت ہے: :کون بنے گا کروڑپتی کھیلو بگ باس کھیلو کھیلو،کھیلو۔مگر راسپوٹین کا کھیل خطرناک ہے،خطروں کے کھلاڑی ہی اس کھیل کو کھیل سکتے ہیں۔سٹیپ بائی سٹیپ کھیلو،سٹیج بائی سٹیج کھیلو۔راسپوٹین کا کھیل نشہ ہے۔راسپوٹین جنون ہے،نجات ہے،بغاوت ہے۔اور سیاہ مرکزی نقطہ اس کا ایجنٹ ہے۔

دلدلی جزیرے میں لکشمی کا دم گھٹ رہا تھا۔ راسپوٹین کا اگلا حکم کیا ہوگا؟اب اسے کہاں جانا ہوگا؟ کیا کرنا ہوگا؟ تبھی گہرے نیلے سمندری فرش کو توڑتا ہوا ایک نیلا کوہسار ہوا میں اُچھلا، سمندر میں ہل چل مچ گئی اور پھر سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے کوہسار تیزی سے جزیرے کی طرف بڑھ چلا۔کوہسار کا وسیع غار جیسا منہ کھلا ہوا تھا جس میں اس کے ہول ناک جبڑے نمایاں تھے۔لکشمی کو یقین ہو چلا تھا کی نیلا کوہسار اسے اور جزیرے کو بے شک نگل جائے گا۔یہی لکشمی کی آخری سٹیج تھی۔

سرد جمے ہوے ماحول میں راسپوٹین کا لہجہ اتنا سرد تھا کی رضیہ کی نسوں میں برق سی سنسنی دوڑ گئی۔راسپوٹین کہہ رہا تھا کرم یا ستم جب حد سے زیادہ بڑھ جائیں تو جینا محال ہو جاتا ہے۔یہ آواز یقیناً ایک مدت گلیشیر میں دبے رہنے کے بعد نکلی ہوگی۔پو پھٹنے کے وقت وہ بے چین ہو گئی۔ اب اسے اپنی آنکھوں پہ اعتماد نہ رہا تھا۔اس کی آنکھیں اسے دھوکہ دے رہی تھیں۔ہر چیز اسے دھوندلی نظر آرہی تھی۔دھوندلی شبیہوں کو دیکھ کر وہ خوفزدہ ہو جاتی تھی۔برف کے نیچے دبی وبی وہ بے بس،سخت ترین آزمائشوں سے گزر رہی تھی۔راسپوٹین نے اسے برفیلے بیاباں میں بھیجا تھا۔راسپوٹین نے تیزاب سے جھلسے چہرے اپ لوڈ کیے تھے اور ساتھ ہی ساتھ برفیلے ویرانے کے لینک بھی ڈاون لوڈ کرنے کا حکم دیا تھا۔دور دور تک برفیلی قبا کے سوا کچھ نہیں تھا۔مشکل تھا پر پھر بھی وہ نکلی اور سردی میں کانپتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔آسماں جو پورے اور چمکتے ہوئے چاند کی وجہ سے پہلے زرد نظر آرہا تھا اب نیل گوں ہوتا جا رہا تھا۔ستارے چھپ گئے تھے۔کہیں آس پاس دھوند میں چھپا دیہات ہے۔ایسا اسے اندازہ ہو رہا تھا۔دیہات سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔اور پھر کہیں دور سے بھیڑیوں کے چیخ چیخ کر رونے کی آوازوں نے اسے خوفزدہ کر دیا، دیہات اُجاڑ تھا۔راتوں رات سب نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔دیہات تعلق سے لاتعلق میں گزر کر چُکا تھا:X تیری سرد مزاجی میں کہیں،روح بھٹکے ہے میری برف کی وادی میں کہیں۔رضیہ پریشان تھی۔ پھر وہ ایک دم سے ششدر رہ گئی۔دھیمی دھیمی نیلی نیلی چنگاریاں جھوپڑوں کو سلگانے لگی تھیں۔دیکھتے ہی دیکھتے گاڑھے نیلے دھویں نے دیہات کو اپنی گرفت میں لے لیا۔نیلی آگ میں جلتے دیہات میں اس کا دم آہستہ آہستہ گھٹنے لگا۔نیلی پڑ چکی برف بھی نیلی آتشوں میں جھلس کر پگھلنے لگی۔

ناکامی،ارمان،بے وفائی،حسد،تجسس اشتیاق، شہرت شناخت،یہ سب مائیکرو چپ میں سمٹی دنیا میں فساد کر رہے تھے۔

راسپوٹین ایک ظالم پُراسرار حیران کر دینے والا شاطر ڈیجیٹل دہشت گرد تھا۔سیاہ مرکزی نقطہ ہیبتناک وائرس تھا جو کالے سوفٹ ویئر کے سحر میں پوشیدہ رہ کر بدعنوانی کر رہا تھا۔راسپوٹین موت کی شاہ راہ تھا جس پر بائکرس سٹنٹ کر رہے تھے۔راسپوٹین ان ڈیسنٹ ٹچ تھا،بدنیتی تھا۔

کیا ڈاکٹر جواگو بلیک ہول اور بلیک سائٹ کا معمہ حل کر پایگا؟ ڈاکٹر جواگو کی خفیہ ایپ بھی راسپوٹین کا سوراگ نہیں لگا پا رہی تھی۔

کہیں دیر نہ ہو جائے،کہیں دیر نہ جائے

زمانے قدیم میں انسان اسے خوف ناک حیوان سمجھتا تھا۔لکین انسان سے بڑھ کر حیوان کون ہو سکتا ہے۔انسان سے پناہ مانگتی یہ بلا اب غائب ہوتی جا رہی ہے۔ساحل پر لاش کا ملنا معمول کے خلاف نہیں تھا۔لاش کی کلائیوں پر زخموں کے نشان تھے اور چاقو سے گودی ہوی تھی بلیو وہیل۔لاش ڈاکٹر جواگو کی تھی۔

□□□

غزل

خیال و خواب ذہن و دل نظر آباد رکھتا ہے
اکیلا ہے مگر وہ کتنے گھر آباد رکھتا ہے

جو آدھی رات چیخیں خانۂ دل سے ابھرتی ہیں
کوئی آسیب ہے جو یہ کھنڈر آباد رکھتا ہے

خوشی تو چند لمحوں کے لئے آتی ہے ہستی میں
مگر غم زندگی کو عمر بھر آباد رکھتا ہے

کسی کے ساتھ رہنا چاہتا ہے کون دنیا میں
ہمیں اک ساتھ تنہائی کا ڈر آباد رکھتا ہے

مرے قاتل ادا کر شکریہ اس واسطے میرا
ترے مقتل کو تنہا میرا سر آباد رکھتا ہے

کبھی پھولوں سے بھی جاتی نہیں ہے اسکی ویرانی
کبھی اک زرد پتہ بھی شجر آباد رکھتا ہے

محبت تیری راہوں پر کہاں چلتا ہے اب کوئی
یہ بیخودؔ ہے جو تیری رہ گزر آباد رکھتا ہے

رام پرکاش بیخودؔ
چاندن، نزد اندرا نگر، لکھنؤ
موبائل: 9450359535

غزل

پھر بلاغت سے فصاحت سے سجاؤ یارو
اب تو اردو سے سیاست کو ہٹاؤ یارو

مار ڈالے نہ کہیں اس کو سیاست کا زہر
میر و غالب کی وراثت کو بچاؤ یارو

اپنی تہذیب کا ہر حسن نہاں ہے اس میں
اس میں بےکار غلاظت نہ ملاؤ یارو

نرم مخمل سی ہے اردو تو سیاست پتھر
اس کے نزدیک بھی یہ چیز نہ لاؤ یارو

اور بھی پیشے ہیں دولت کے کمانے کے لئے
بیچ کے اردو کو دولت نہ کماؤ یارو

اچھے شعروں کے لئے آج بھی پیاسہ ہے ادب
اب تو مصرعے نہیں میعار اُٹھاؤ یارو

اجئے سحابؔ
کمشنر جی ایس ٹی، بنگلو نمبر ۴، آفس روڈ، بستو پور، جمشید پور
موبائل: 9981512285

غزل

دور دنیا کی حقیقت سے مجھے رکھا تھا
اس نے اس طرح حفاظت سے مجھے رکھا تھا

زندگی تیرے مسائل کا نہ تھا علم مجھے
اس قدر اس نے سہولت سے مجھے رکھا تھا

اب تیرے بعد میں ہمدرد کہوں کس کو بھلا
صرف تونے ہی محبت سے مجھے رکھا تھا

موت جب سامنےا آئی تو یہ احساس ہوا
زندگی نے بڑی چاہت سے مجھے رکھا تھا

اب وہ گھر دوڑ رہا ہے مجھے کھانے کے لئے
برسوں جس نے کبھی عزت سے مجھے رکھا تھا

جان لیوا تھی بہت تجھ سے بچھڑنے کی گھڑی
وقت نے کتنی مصیبت سے مجھے رکھا تھا

مشکلوں میں وہ مجھے چھوڑ گیا کیوں تنہا
جس نے ایک پل بھی نہ دقت سے مجھے رکھا تھا

سیا سچدیو
A-98، راجندر نگر، بریلی
موبائل: 8958451421

غزل

آنکھوں نے کہہ دیا جو کبھی کہہ نہ پائے لب
حالانکہ اس نے بارہا اپنے ہلائے لب

چہرے سے جب نقاب ہوا نے الٹ دیا
دیکھا مجھے تو دانت سے اس نے دبائے لب

میری تلاش پوری ہوئی دیکھ کر اسے
آنکھوں سے آنکھیں چار ہوئیں مسکرائے لب

رودادِ غم سناؤں تو کس کو سناؤں میں
اظہارِ غم کو یوں تو بہت تلملائے لب

صحرا میں آنسوؤں کے سمندر کو دیکھ کر
سنجیدگی کی دھن پہ بہت گنگنائے لب

لالی لگاکے ہونٹ پہ چمکی لگائی جو
تاروں بھرے گگن کی طرح جھلملائے لب

دل میں رقیبؔ کھوٹ تھی شاید اسی لئے
اظہارِ عشق کرتے ہوئے تھرتھرائے لب

ستیش شکلا رقیبؔ
B-204، ایکسل ہاؤس، جوہو، ممبئی
موبائل: 9892165892

غزل

چراغ کی لَو میں انکساری، ہوا کے تیور سپاہیانہ
بھرا پڑا ہے اسی طرح کی ضدوں سے میرا اصول خانہ

ہمارے احساسِ آگہی کی یہ سادہ لوحی نہیں تو کیا ہے
اسے تو مانا ہی جس کو جانا جسے نہ جانا اسے بھی مانا

نہ تو ہمارا ہی چہرہ بدلا نہ آئینے ہی میں بدلاؤ آیا
فقط مراسم بدل گئے ہیں فریب دینا فریب کھانا

وراثتوں کی تمام دولت لٹا چکا ہوں کبھی کا لیکن
ابھی بھی دنیا کو یہ گماں ہے بھرا ہوا ہے مرا خزانہ

جہاں بھی دیکھی وفا کی مورت وہیں پہ سر جھک گیا ہمارا
اگر یہ فطرت ہے کافرانہ تو اس کو رہنے دو کافرانہ

یہ ہم پیالہ وہ ہم نوالہ یہ ہم وطن ہیں وہ ہم زباں ہیں
ندیمؔ کوئی بتائے ہم کو ہے کون رشتہ برادرانہ

اوم پرکاش ندیمؔ
5-D/25، ورنداون کالونی، تیلی باغ لکھنؤ
موبائل: 9456460659

غزل

سفر میں منزلوں سے دوریاں اچھی نہیں لگتیں
کسی بھی شخص کو مجبوریاں اچھی نہیں لگتیں

ملے گی کامیابی ہو اگر چہ عزم مستحکم
رُخِ انسان پر مایوسیاں اچھی نہیں لگتیں

خوشی سے جھوم اٹھتے جب پرندے چہچہاتے ہیں
شجر کو دیر تک خاموشیاں اچھی نہیں لگتیں

انہیں سے ونش بڑھتا ہے انہیں سے ہر مکاں گھر ہے
وجہ کیا ہے کہ پھر بھی بیٹیاں اچھی نہیں لگتیں

دہکتے جون میں بھی جن گھروں میں جنوری لگتی
انہیں برسات کی یہ بدلیاں اچھی نہیں لگتیں

اجالے، زندگی، سرگم سبھی کچھ سیاہ سائے ہیں
شکھرؔ سے دیکھئے گہرائیاں اچھی نہیں لگتیں

رمیش پانڈے شکھر
نزد وکاس چوراہا، کھٹار روڈ، گولاکھیری
موبائل: 9532070533

غزل

سمٹ کر رہ گیا ہوں بیکراں ہونے کی کوشش میں
زمیں سے بھی گیا میں آسماں ہونے کی کوشش میں

پھر اس کے بعد رشتہ کٹ گیا میرا اجالوں سے
بجھا تھا ایک شب یونہی دھواں ہونے کی کوشش میں

کہیں دریا کی موجیں تھک گئیں اپنی روانی سے
کہیں ہے جھیل کا پانی رواں ہونے کی کوشش میں

مکمل فکر کب الفاظ کے پیکر میں ڈھلتی ہے
بہت کچھ رہ بھی جاتا ہے بیاں ہونے کی کوشش میں

اب اتنا بھی نہ پُر اسرار رکھ اپنے رویئے کو
جو ظاہر ہوتا جاتا ہے نہاں ہونے کی کوشش میں

خوشبیر سنگھ شادؔ
بی۹، سلورریزیڈنسی اپارٹمنٹ، نکودرروڈ، جالندھر
موبائل: 9872011882

غزل

میں نہ سویا ساری رات، تم کہو
بن مرے کیسے گزاری، تم کہو

ہجر، آنسو، درد، آہیں، شاعری
یہ تو باتیں تھیں ہماری، تم کہو

حال مت پوچھو مرا، یہ حال ہے
جسم اپنا، جاں ادھاری، تم کہو

رکھ دو بس میرے لبوں پر انگلیاں
میں سنوں گا ساری رات، تم کہو

پھر کبھی اپنی سناؤں گا تمہیں
آج سننی ہے تمہاری، تم کہو

روک لو کانہاؔ اسے جاتا ہے وہ
وہ نہیں سنتا ہماری، تم کہو

پرکھر مالویہ کانہاؔ
بروہی چوبے، رسول پور نندلال، سگڑی، اعظم گڑھ
موبائل: 9911568839

غزل

اپنی غیرت کے علاوہ کہیں دیکھے نہ گئے
خود سے نکلے تھے مگر غیر کے پیچھے نہ گئے

تم کو افسوس تمہیں ٹھیک بنایا نہ گیا
اور ایک ہم کہ ابھی چاک پہ رکھے نہ گئے

اک ستم یہ کہ ہمیں وصل میں آیا نہ سکوں
اک ستم یہ کہ ترے ہجر بھی دیکھے نہ گئے

سنگ اس کے تو محبت میں سلیقے سے کٹی
بعد اس کے بھی بدن سے یہ سلیقے نہ گئے

تیرے آنے پہ کہاں سر پہ اٹھا لیتے تھے گھر
تیرے جانے پہ ترے پیچھے دریچے نہ گئے

اس کی خوشبو کو بھی رخصت نہ کیا جاتا تھا
ہم سے کچھ روز تو کپڑے بھی اتارے نہ گئے

نویش ساہو
277/2، شکتی نگر، بھوپال
موبائل: 8959539570

غزل

نہ درمیاں نہ کہیں ابتدا میں آیا ہے
بدل کے بھیس مری انتہا میں آیا ہے

کبھی جو تیز ہوئی لو تو جگمگا اٹھا
برہنہ تھا جو کبھی اب قبا میں آیا ہے
مجھے ہے پھول کی پتی سا اب بکھر جانا
وہ چھپ چھپا کے مری ہی ردا میں آیا ہے

اسیر زلف کو شاید یہیں رہائی ہے
پکارتا ہوں جسے وہ صدا میں آیا ہے

نگل گئی ہے تصور کی آنچ آنچ اسے
کوئی وجود کسی سانحہ میں آیا ہے

میں چھیڑتا ہوں سمندر کی دھن میں نغموں کو
وہی جو راگ دل مطربہ میں آیا ہے

اسی کے شعر سبھی اور اسی کے افسانے
اسی کی پیاس کا بادل گھٹا میں آیا ہے

وشال کھلر

غزل

شام ہوتے ہی سب اپنے گھر جائیں گے
جن کا گھر ہی نہیں وہ کدھر جائیں گے

کار سے جھگیوں میں نہ آیا کریں
ان غریبوں کے سپنے بکھر جائیں گے

صرف روٹی کے سپنوں پہ زندہ ہیں جو
جھوٹے وعدوں سے وہ لوگ مر جائیں گے

وقت آخر کو مرہم بنے گا مرا
زخم جتنے لگے ہیں وہ بھر جائیں گے

کون پوچھے گا اس روز پھر آپ کو
آپ کرسی سے جس دن اتر جائیں گے

ہاں، مصیبت کے جتنے عناصر ہیں سب
حوصلہ دیکھ کر میرا ڈر جائیں گے

سیما کشی وشال شریواستو
20/3، پیلی کالونی، عیش باغ لکھنؤ
موبائل: 8707051646

غزل

عشق میں اتنا خسارہ کیوں کیا تھا
آپ نے پردہ گوارا کیوں کیا تھا

آپ تو ہم کو سمندر میں ملے تھے
آپ نے ہم سے کنارہ کیوں کیا تھا

روشنی چبھنے لگی آنکھوں میں دن کی
رات نے تنہا گزارا کیوں کیا تھا

آپ کا سجدہ مکمّل کیوں نہیں تھا
آپ نے سجدہ دوبارہ کیوں کیا تھا

آپ کے اب ہوش کیا باقی رہیں گے
آپ نے اپنا نظارہ کیوں کیا تھا

آپ کا خود پر کوئی اب حق نہیں ہے
آپ نے خود کو ہمارا کیوں کیا تھا

جان لینے کی اگر خواہش نہیں تھی
وار پھر اتنا کرارا کیوں کیا تھا

منیش شکلا
8/4، ڈالی باغ، آفیسرس کالونی لکھنؤ
موبائل: 9415101115

مرزا جعفر حسین

۱۸۹۹ء ۱۹۸۹ء

پسماندہ طبقہ کا طرزِ زندگی

پسماندہ طبقات کے عوام کا طرزِ زندگی پوری طرح سمجھنے کے لئے اس عظیم اور نمایاں فرق کا جائزہ لینا چاہئے جو امیروں اور غریبوں کی ذہنیت مین پایا جاتا تھا۔ قدیم لکھنؤ کا تمام کلچر تصنع اور مبالغہ کی بنیادوں پر استوار تھا اور یہ دونوں خصوصیات عیب نہیں تھے بلکہ اس معاشرہ کا زیور تھے۔ امراء اور شرفا کی سیرتوں میں بہت سی بلندیاں انہیں بظاہر عیوب کی بدولت پیدا ہوئی اور پروان چڑھی تھیں۔ غرباء و مساکین کی خاطرہ خواہ حاجت برآری بہت کچھ مبالغہ آمیر سرشت کا نتیجہ ہوتی تھی اور امراء کی دماغی الجھنوں کا ان کے تصنع پسند مزاج و مذاق کی بدولت دنیا کو پتہ بھی نہیں چلتا تھا۔ پسماندہ طبقہ وال اپنے معاشی اور مالی حالات کا تصنع اور مبالغہ سے بری ہو کر اندازہ کرتے اور اپنی چادر ہی میں پاؤں پھیلانے کی فکر کرتے تھے۔ اگر ان کے وسائل ناکافی ہوتے اور اپنی جد و جہد میں ناکام ہو جاتے تو وہ اپنی تقدیر پر صبر و شکر کر کے قناعت کر لیتے تھے۔ ان کے اس جذبات قناعت میں ایک حد تک روحانی طاقت تھی اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس دور کے سیاسی کارکن ان کی محرومیوں سے تنگ آ کر ان کو آسانی سے مشتعل نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ ہر تکلیف میں زندگی بسر کر لے جانا اپنی حیات کا ماحصل سمجھتے تھے۔

قناعت کوشی کے ساتھ ان میں احساس ذمہ داری بھی تھا۔ دھوبی ہو یا بہشتی، حجام ہو یا مہترانی، نوکر چاکر ہوں یا اجیر و خدمت گزار، ان سب طبقات کے افراد اپنے کاروبار پر وقت مقررہ سے کچھ پہلے ہی پہنچ جاتے تھے۔ دور حاضر کی طرح پابندی وقت کے لئے قوانین وضوابط نہیں تھے۔ کام لینے والوں میں خود ایسے لوگ بہت کم تھے جو وقت کی اہمیت ملحوظ رکھتے تھے لیکن یہ کارگزار دیر میں پہنچنے کے بجائے کچھ قبل ہی پہنچنے اور اس کا خیال رکھتے کہ مالک کی خوشنودی کے مطابق کام ہو جائے۔ ان کا یہی احساس اس صورت حال کا اسباب میں ایک سبب تھا کہ اس زمانہ میں ملازم ہوں یا وقتی خدمت گزار برطرفی کا کوئی طریقہ رائج نہیں تھا بلکہ کام لینے والے اور کام کرنے والے کے درمیان ایک مرتبہ رشتہ قائم ہونے کے بعد مدتوں بلکہ بسا اوقات نسلاً بعد نسلٍ چلا کرتا تھا۔ رئیسوں کے یہاں کئی کئی پشت کے خدمت گار تھے اور کام بنوانے والوں کے یہاں بھی دادا سے لے کر پوتے تک کاریگری کیا کرتے تھے۔ بہرحال یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ دائمی ملازمت کا رشتہ بلا استثنا ہر جگہ برقرار تھا لیکن برطرفی کو ہم ضرور مستثنیات میں شامل کرنے پر مجبور ہیں۔ پابندئ وقت اور حسن خدمت کے معاوضہ میں انعام و اکرام کا چلن عام تھا اور یہی انعام و اکرام غریب طبقوں کے کام کرنے والوں کے لئے بڑی نعمت ہوا کرتا تھا۔ انعام و اکرام میں کام کرنے والوں کے بچوں اور عورتوں کے ضروریات بھی ملحوظ رکھے جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ فلاکت کے باوصف پسماندہ طبقوں کے عوام بھی میلوں وغیرہ میں سیر و تفریح کے لئے جاتے تو ان کے بدن پر اچھا لباس نظر آ جاتا تھا ان انعامات سے بہشتی، مہتر، مہترانیاں، حجام اور

'نہ روم، نہ اتھینس، نہ قسطنطنیہ اور نہ ہی کوئی دوسرا شہر اتنا دلکش اور دلفریب ہوگا جتنا یہ شہر'

۱۸۵۸ میں لندن کے ٹائمس اخبار کے نامہ نگار ولیم رسیل نے یہ جملہ لکھنؤ کے لئے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا تھا۔ سیدھے سادے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ نوابین اودھ کا عہد اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ پورے ہندوستان کے افق پر غالب تھا۔ لکھنؤ شہر کی شان و شوکت کے قصے عالمی سطح پر مشہور ہونے لگے تھے۔ نواب شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے دور کے لکھنؤ کو جتنی مقناطیسیت حاصل ہوئی، اتنی شائد ہی دوسرے کسی شہر کو نصیب ہوئی ہو۔

پھر وہ دور بھی آیا جب شاداب کلیاں بادِ سموم کے جھونکوں سے کمھلانے لگیں اور سارا ماحول تغیر پذیر ہو گیا۔ پرانی قدروں پر نیا مزاج حاوی ہونے لگا تب اس شہر کی ہیئت بدل گئی۔ لکھنؤ اپنے شاندار ماضی سے مستقل نبرد آزما رہتا ہے، دور کوئی بھی ہو، شعراء، ادباء اور فنکاروں کی دلچسپی اب بھی اسی گزشتہ لکھنؤ میں زیادہ نظر آتی ہے۔

'دامن کو چھوڑتی ہی نہیں لکھنؤ کی خاک'

اسی کے پیش نظر 'نیا دور' کے ہر شمارے میں 'گزشتہ لکھنؤ' کے عنوان سے ایک نہ ایک ایسی تحریر پیش کی جائے گی جس میں خطۂ اودھ اور بالخصوص لکھنؤ کے ادبی و تہذیبی سماج کی عکاسی نظر آئے۔ مقصد بازیافت ہے۔ اس سلسلہ کی پندرھویں کڑی کے طور پر **مرزا جعفر حسین** کی کتاب **قدیم لکھنؤ کی آخری بہار** سے ایک تحریر **'پسماندہ طبقہ کا طرزِ زندگی'** حاضر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلہ پسند کیا جائے گا۔ 'نیا دور' ایسی تمام تحریروں کا خیر مقدم کریگا جن میں گزشتہ لکھنؤ کی جھلک نظر آئے۔

(ایڈیٹر)

خدمت گزاروں کے ساتھ مناسب موقع پر سلوک کر دیا کرتے تھے۔

اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی کے اوقات میں وہ لوگ ہمہ تن اپنے اپنے مالکوں کی دلجوئی اور خوشنودی کی فکر میں غرق رہتے لیکن اس کے بعد اپنے اہل وعیال کی طرف پوری توجہ مبذول کرتے تھے۔ بچے کھلاتے، کوئی بیمار ہوتا تو دوا علاج کی فکر کرتے اور گھر داری کے امور میں اپنی شریک زندگی کا جتنا ممکن ہوتا ہاتھ بٹاتے تھے۔ان کی عورتیں اپنے شوہروں کی مطبع اور اپنے بچوں کے لئے انّا، کھلائی، دوا، چھوچھو سب کچھ ہوتی تھیں۔ امیروں اور رئیسوں کی بیگمات اپنے بچوں کو دودھ نہیں پلاتی تھیں، اپنے پاس سلاتی بھی نہیں تھیں لیکن ان کی طرف سے بے پروا بھی نہیں ہوتی تھیں، غذا وصحت کا ہمہ وقت خیال رکھتی تھیں۔ اگر کبھی کوئی بچہ بیمار ہوجاتا تو راتوں کو اٹھ اٹھ کر اس کا چہرہ دیکھتیں، نبضیں ٹٹولتیں اور سانسیں گنتی تھیں۔ ان غریبوں کی عورتیں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو ہر وقت نظر کے سامنے رکھتی اور کلیجے سے لگائے رہتی تھیں۔ ہندوستانی ماں کی مامتا انہیں غریب عورتوں میں تھی اور ان کے شوہر ہر مشکل وقت میں شریک کار رہتے تھے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ ساری گھرداری مرد اور عورت دونوں کے تعاون سے چلتی تھی۔ ان زمانہ میں یہ کہاوت بہت مشہور تھی کہ جس طرح لڑھیا بغیر بیلوں کی جوڑی کے نہیں چل سکتی اسی طرح گھرداری بھی جب ہی چل سکتی ہے میاں اور بیوی دو بیلوں کی طرح ایک مقصد کے تحت باہمدگر تعاون و اشتراک کریں۔ مالی مشکلات کی بدولت زن وشوہر زیادہ تر گھروں میں نیم برہنگی کی زندگی بسر کرتے تھے لیکن ایسا وقت نہیں آنے دیتے تھے کہ کوئی بچہ فاقہ سے سو رہے۔

لکھنؤ کے معاشرہ نے غریبوں کے لئے بھی سیر وتفریح کے مواقع فراہم کر رکھے تھے۔ رؤسا وعمائدین کے محلوں میں اگر ڈیرے دار طوائفیں رونق محفل ہوا کرتی تھیں تو غریب من چلے نوجوان گڑھے والی سرائے یا چاول والی گلی میں اپنی سستی تفریحات کا سامان مہیا کر لیتے تھے۔ ان دلچسپیوں میں پھر بھی کچھ نہ کچھ رقم خرچ ہوتی تھی۔ بلاخرچ کی تفریحات بھی بے شمار ہوتی تھیں۔ ماہ محرم کے علاوہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا تھا کہ کسی نہ کسی محلہ میں میلہ نہ لگتا ہو۔ بعض میلے بہت عالیشان ہوتے تھے جہاں پسماندہ طبقہ کے عوام بھی آزادی کے ساتھ گھوم کر چشم و گوش کو آسودہ کر لیتے تھے۔ اس کے علاوہ اپنے اپنے گھروں میں بھی کچھ نہ کچھ دل بستگی کا سامان فراہم کر لیتے تھے۔ کسی معمر اور بزرگ طبقہ حجام کے یہاں دوسرے ہم پیشہ جمع ہو جاتے تو شطرنج یا گنجیفہ کا کھیل شروع ہوجاتا اور گھنٹوں تک یہ تفریح ہوتی رہتی تھی۔ اس کھیل میں نہ بازی لگتی تھی اور نہ شرط بدی جاتی تھی۔ کچھ تو عصمت بی بی از بیچارگی تھی کیونکہ روپیہ جیب میں نہ ہوتا اور کچھ ان غریب لوگوں کو پیسہ برباد کرنے سے نفرت تھی۔ ان کے مزاج میں اسراف کا کبھی کوئی شائبہ تک نہیں آتا تھا۔ کفایت شعاری ان کی زندگی کا جزو بن گئی تھی۔ حجاموں کے علاوہ دوسرے پسماندہ طبقات والے بھی اپنے اپنے مقام پر کچھ نہ کچھ تفریح کا انتظام رکھتے تھے۔ بہشتیوں کو عام طور سے ڈھولک بجانے کا شوق تھا۔ یہ لوگ فرصت کے اوقات میں اپنے بچوں کو پاس بٹھا لیتے اور خوب مزے سے ڈھولک بجاتے اور کچھ چھوٹے چھوٹے خاص قسم کے گیت گاتے تھے جن سے بچوں کو بہت دلچسپی ہوتی تھی۔ اس طرح گھر کے مالک کو تفریح کا موقع مل جاتا۔ اپنے بھی بہلتے رہتے اور شریک زندگی کو اپنے فرائض انجام دینے کے لئے سکون مل جاتا تھا۔ گانے بجانے کے اس مشغلہ میں مہتروں کا پلہ تمام دوسرے پسماندہ طبقات سے مقابلتاً بہت بھاری تھا۔

مہتروں میں بھی دو درجے قائم تھے۔ کچھ لوگ صرف جھاڑو دے کر زمین صاف کرتے اور کوڑا کرکٹ دور کر دیتے تھے۔ ان کو خاک روب کہا جاتا تھا۔ جو لوگ فضلہ اٹھاتے اور پائخانے دھوتے تھے وہ مہتر کہلاتے تھے۔ رؤسا کے یہاں بیرونی نشست گاہ میں خاک روب اور مہتر علیٰحدہ علیٰحدہ اپنے فرائض انجام دیتے تھے لیکن زنانہ محل میں مہترانیاں ہی دونوں خدمات پر مامور رہتی تھیں۔ خاک روب ہوں یا مہتر اور مہترانیاں، ان سب سے امرا اور شرفا کو جب وہ جھاڑو، پنجہ یا ٹوکرا ہاتھ میں لئے ہوتے تو بہت ہی زیادہ کراہت رہتی تھی اور حتی المقدور ان کا سامنا ہونا تک گوارا نہیں کرتے تھے لیکن تمام ملازموں کے غیر اوقات میں صاف کپڑے پہن کر سامنے آکر آداب بجالاتی تھی تو بیگم صاحبہ بلاتکلف فرماتی تھیں کہ بیٹھ جاؤ اور کنیز کو حکم دیتی تھیں کہ اس کو پان بنا کر کھلا دو۔ اس پیشہ ور کو مہتر کہنا ہی واضح کرتا تھا کہ اس کے اہم جذبات کا اعتراف کیا جاتا تھا۔ یہ لوگ بھی اپنے مالکوں کی اطاعت اور وفاداری میں کوئی کمی نہیں کرتے تھے۔ ہر خوشی کے موقع پر باجا لے کر حاضر ہوتے اور بامراد واپس جاتے تھے۔

کہا جاتا تھا کہ پرانے طرز کا بینڈ ہمارے شہر کے مہتروں کی ایجاد تھی۔ امراء وشرفا کے یہاں ہر شادی کے موقع پر نیز محرم کے جلوسوں میں مہتروں کا بینڈ ہونا پہلے بھی ضروری تھا اور اب بھی ضروری ہے۔ یہ لوگ نہا دھو کر خوشنما وردیوں میں اپنے اپنے صاف و شفاف باجے لے کر آتے اور خوب خوب بجاتے تھے۔ ان کو پہلے سے معلوم ہوجاتا تھا کہ فلاں فلاں تاریخ و وقت فلاں فلاں مقام پر جانا تھا۔ جتنی بلند ڈیوڑھی پر جانا ہوتا اتنا ہی زیادہ ریہرسل کیا جاتا۔ یہ مصروفیت برابر رہا کرتی تھی اور ریہرسل کے موقع پر نیز جلوسوں میں بینڈ کے ہمراہ برادری کے اور بہت سے مہتر بھی شرکت کیا کرتے تھے۔ اس طبقہ کے لوگوں کے لئے اس طرح یہی بجانا بہت بڑی تفریح ہوتی تھی۔ اس زمانہ میں مئے

نوشی شدید ترین گناہ اور بہت بڑا عیب سمجھی جاتی تھی۔ رؤسا و شرفا میں جو لوگ یہ شوق کرتے تھے وہ بھی اس کو معصیت سمجھ کر مستوریوں ہی میں ارتکاب کے قائل تھے۔

بدکردار، بدقماش اور مردود خلائق افراد کے علاوہ پسماندہ طبقات کے عوام بھی دیدہ دلیری کے ساتھ شراب خانے جا کر بالاعلان مے گساری نہیں کرتے تھے۔اس زمانے میں نہ بار تھے اور نہ ولایتی طرز کے شراب ہوتے تھے۔ بھٹی میں شراب بنتی اور وہیں فروخت ہوتی تھی۔ آٹھ آنے میں بوتل ملتی تھی اور یہ خالص دیسی شراب سونف، سنگترہ، گلاب وغیرہ کی بنتی تھی۔ بوتل کھل جاتی تو سارا ماحول معطر ہو جاتا تھا۔ ذائقہ شیریں و تلخ ہوتا تھا۔ پسماندہ طبقات میں مہتروں کا ہی وہ گروہ تھا جو بالاعلان شراب پیتے تھے۔ اپنے یہاں شادی وغیرہ کے موقع پر مئے خواری کے لئے صلائے عام دیا کرتے تھے اور ریہرسل کرنے میں بھی تھوڑی بہت پی لینا ضروری تھا۔لیکن ایسے ریہرسل ان مقامات پر ہوتے تھے جہاں چھوٹے چھوٹے کچے مکانوں اور جھونپڑوں میں صرف مہتروں کی آبادی ہوتی تھی۔ یہ لوگ پی پی کر بہت زیادہ مست ہو کر ہلڑ ہنگامہ برپا کرتے اور آپس میں بہت گالم گلوچ بھی کرتے تھے لیکن اس طرزِ عمل کو ہم فتنہ و فساد نہیں کہہ سکتے تھے۔ جو مہتر ملازم پیشہ ہو کر رؤسا و عمائدین کے عطا کردہ اراضیات میں مقیم ہوتے تھے وہ ایسے تمام ہنگاموں سے اپنی قیام گاہوں کو محفوظ رکھتے تھے۔ وہ پیتے بھی تو خاموشی سے گھر میں پڑ رہتے۔ بعض مہترانیاں بھی شراب پیتی تھیں۔

پسماندہ طبقات کے عوام میں باہمی مناقشات بھی بہت کم نمودار ہوتے تھے۔ زن، زر اور زمین جھگڑے کی جڑ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ زر اور زمین سے بے نیاز تھے البتہ ان کے باہمد گر اختلافات ک بیوی، بہو، کوئینہ کوئی عورت ہی سبب ہوا کرتی تھی۔ اس زمانہ میں رؤسا و شرفا بھی کچہری اور عدالت کا نام سن پر کانوں پر ہاتھ دھر لیتے تھے۔ غربا تو مجبوراً بھی ادھر کا رخ نہیں کر سکتے تھے لیکن ان کے پاس خود اپنی قائم کردہ عدالتیں تھیں جن کے احکام اخلاقاً واجب التعمیل ہوا کرتے تھے۔ کوئی شخص یا خاندان سرتابی کرتا تو برادری میں مطعون ہو جانے اور حقہ پانی بند ہو جانے کی سزا ناقابل برداشت ہوتی تھی۔ ایسی عدالتیں پنچایتوں کے نام سے موسوم تھیں۔ حجاموں، بہشتیوں، مہتروں وغیرہ میں سب کی علیٰحدہ علیٰحدہ پنچایتیں تھیں جو اپنی اپنی برادری والوں کے مناقشات فیصلے کرتی تھیں۔ اس موقع پر پنچوں کے علاوہ برادری کے مقتدر اور معمر اشخاص بھی جمع ہو جاتے تھے۔ یہ فریقین معہ اپنے متعلقین اور بہی خواہوں کے حاضر ہو کر اپنا اپنا مقدمہ پیش کرتے تھے۔ پنچ ان لوگوں سے جرح کرتے، ان کی پیش کردہ شہادتیں سنتے، معمر اور بزرگ لوگوں کے مشورے طلب کرتے اور بالآخر اپنا فیصلہ صادر کر دیتے تھے۔ یہ پنچایتیں عموماً کسی غیر آباد جگہ پر ہوتی تھیں تاکہ فریقین کی برادری والوں کے علاوہ کوئی اور جھگڑے کے واقعات سے باخبر نہ ہو سکے۔ کبھی کبھی یہ پنچایتیں طول پکڑ جاتی تھیں اور کئی کئی دن تک نشستیں ہوتی تھیں۔ ان طبقات کے لوگوں میں مختلف مذاہب کے افراد ہوتے تھے لیکن پنچوں کے فیصلے کسی مخصوص مذہبی روایات کے عام طور سے حامل نہیں ہوتے تھے۔ برادری کے مرتب کردہ ضوابط جو صرف سینہ بہ سینہ چلتے آتے اور جن کی تائید میں صرف عمل درآمد کے روایات ہوتے تھے، نافذ کئے جاتے تھے، ان کو قبول کرنے میں بہشتی اور حجام غالباً کبھی تامل نہیں کرتے تھے۔ یہ دونوں طبقہ بہت خاموش اور متحمل مزاج کے مالک تھے۔ اپنی حق تلفیوں کو بھی ضبط و سکون سے انگیز کر لیتے تھے لیکن مہتروں کی جماعت پنچایت کی کارروائیوں کے دوران بھی ہنگامہ آرائیوں سے باز نہیں رہتی تھی۔ کبھی کبھی پنچایت کے فیصلوں سے بھی بعض افراد بغاوت کر دیتے تھے جس کے نتیجہ میں برادری سے اخراج ہوتا اور ان کو طرح طرح کے تکالیف برداشت کرنا پڑتے تھے بالآخر کچھ اعزاز و اقارب بیچ میں پڑ کر دوسری پنچایت کرا کے معاملہ رفع دفع کرا دیتے تھے۔

□□□

نیا دور کے مختلف نمبر کتابی شکل میں

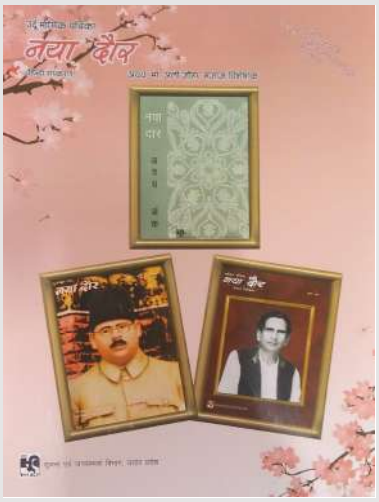

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے 'اودھ نمبر، محمد علی جوہر نمبر اور مجاز نمبر' بھی شامل ہے۔ پہلے اسے الگ الگ شائع کیا گیا تھا لیکن اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعہ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰ روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰ روپئے ملا کر کل قیمت ۲۵۰ روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

نرملا بھراڑیا
اندور، مدھیہ پردیش
موبائل: 9425057841

باپ بیٹی

سگنل پر کار رکی تو وہ پلٹا اور میری جانب ایک ٹافی بڑھا دی۔ میں نے کہا، یہ کیا وجئے؟ تب تک وہ اپنی گردن واپس موڑ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ اسٹیرنگ پر اور نگاہیں سڑک پر تھیں۔ جیسے ہی سگنل ہرا ہوا، اس نے شیشے میں سے ایک اڑتی سی نگاہ عقب میں ڈالی اور گاڑی چلاتے ہوئے وہ میرے ہاتھ میں ٹافی دینے کی وجہ بتانے لگا۔

'میڈم، ذرا آپ پڑھ دو نا اس پر کیا لکھا ہے؟ اچھی کمپنی کی تو ہے نا؟ خراب وراب تو نہیں؟'

'ہاں، اچھی ہے۔ اپنی گڑیا کے لئے لائے ہو نا؟'

'ہاں، گڑیا کے لئے ہی ہے۔ پر میں نے خریدی نہیں ہے، آپ کے آفس کے دوسری منزل پر آج ایک آدمی بانٹ رہا تھا۔ اس کے بیٹے کی سالگرہ تھی۔ میں دکھا تو اس نے مجھے بھی پکڑا دی چار پانچ۔ پر یہ دیکھنا تو ضروری ہے کہ نا کہ ایسی ویسی ٹافی نہ ہو، کہیں گڑیا کی طبیعت خراب نہ ہو جائے۔ اسی لئے سوچا آپ سے پڑھوالوں۔'

'بہت پیار کرتے ہو گڑیا سے؟'

کچھ شرما کر آہستہ آواز میں کہا، 'ہمم۔۔۔۔ میڈم، وہ تو ہے۔'

کچھ دیر گاڑی یوں ہی چلتی رہی۔ وجئے اور میری کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں کھڑکی سے یوں ہی جھانک کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اتنے میں پھر وجئے کی آواز سنائی پڑی۔

'ویسے میں نے ایک ٹافی کھا کر بھی دیکھ لی تھی کہ اس میں کوئی خراب مال تو نہیں ہے۔ خراب ہوتی تو اب تک تو میرا جی گھبرا جاتا۔'

'سو تو ہے۔' میں نے کہا اور اپنا سر سیٹ پر ٹکا کر جھپکی لینے کی کوشش کرنے لگی۔ آخر گھر پہنچنے میں تیس پینتیس منٹ تو لگیں گے ہی۔ آنکھ بند کرتے ہی میں نے سوچا، وجئے کتنا پیار کرتا ہے اپنی بٹیا سے۔

گھر آیا اور میں کار سے اتری تو دیکھا کہ گڑیا

ہندی زبان کی مشہور افسانہ نگار اور شاعر۔ ہندی روزنامہ 'نئی دنیا' کی سینئر ایڈیٹر، نثر و نظم کی نو (۹) کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ دو ناول 'آبجکشن می لارڈ' اور 'غلام منڈی' بھی شائع ہو چکی ہیں۔ صحافت و ادب میں نمایاں خدمات کے لئے مدھیہ پردیش ساہتیہ پریشد 'بال کرشن شرما نوین' اعزاز سمیت دیگر متعدد انعامات سے سرفراز۔ پیش ہے ان کی کہانی **'باپ بیٹی'** جس کا اردو ترجمہ **'رائحہ تقوی'** نے کیا ہے۔

اس کے گھر سے ہمارے پورچ کی جانب بھاگتے ہوئے آ رہی ہے۔ خوشی سے چلاتے ہوئے، پاپا جی آ گئے، پاپا جی آ گئے۔ وہ کار کی آواز ہی سے سمجھ جاتی ہے کہ اس کے پاپا آ گئے ہیں۔

اندر جاتے ہوئے میں نے کن انکھیوں سے اس جانب دیکھا تو گڑیا کبوتری سی گول گول ناچتے ہوئے بول رہی تھی۔ پاپا جی آ گئے، پاپا جی آ گئے اور لمحہ بھر میں وہ وجئے کی گود میں تھی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈالے اتر رہی تھی۔

میں نے ایک دن وجئے سے پوچھا، 'کیوں؟ یہ پاپا جی، ممی جی کیا سکھا رکھا ہے بٹیا کو' تو اس نے بھی فوراً جواب دیا، 'یہ تو لگنا چاہئے کہ میڈم کہ اچھے گھر کی بچی ہے۔' اب وجئے کے اس ترک کے سامنے بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

وجئے کو سگنل پر گاڑی رکنے پر گردن گھما کر بات کرنے کا بہت شوق ہے۔ اس کی بھابی کرن میرے گھر کا کھانا بناتی ہے۔ وجئے گاؤں سے آیا تھا تو اس کے بھائی 'گجّو' نے اسے گاڑی چلانا سکھائی تھی۔ ایجنٹ کو بیچ میں ڈال کر آر ٹی او سے اس کا لائسنس بنوایا تھا اور کرن نے ہی اسے میرے پاس ڈرائیور لگوایا تھا۔ اس وقت وجئے کی شادی نہیں ہوئی تھی اور دیور بھابی کی خوب پٹتی تھی۔ شادی کے بعد شاید یہی بات وجئے کی بیوی کو کھٹک گئی۔ جب دیورانی جٹھانی میں جھگڑے ہونا شروع ہوئے تو بیوی کی طرفداری میں وجئے بھی اپنی بھابی کا دشمن ہو گیا۔ اب میں کس کی سنوں؟ ان کی شکایتیں اور الزام بھی عجیب عجیب ہوتے تھے۔ خیر، جو الزام لگانے کے لئے گڑھے جاتے ہیں وہ تھوڑے عجیب تو ہوتے ہی ہیں۔ ان میں لگا ہوا نمک اور مرچا آپ کو صاف دکھائی دیتا ہے۔

کرن کے تین بچے ہیں۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ بیٹی سب سے چھوٹی ہے۔ بیٹی بھی کرن کو پیاری ہے اور اس نے بیٹی کو بھی بیٹوں کی طرح پرائیوٹ اسکول میں ایڈمیشن دلایا ہے۔ کرن ہوشیار بھی ہے۔ کلکٹریٹ جا کر اپنے بچوں کی ذات کا سرٹیفکٹ بھی صحیح

وقت پر لے آئی تھی۔ اس لئے فیس بھی کم لگتی ہے۔ خود ہی کے بچے کیوں، کسی بھی رشتے دار کو کلکٹریٹ، نگرنگم، اسکول، اسپتال کے کوئی کاغذات بنوانے کا کام پڑتا ہے تو وہ کرن ہی کے پاس آتے ہیں۔ سب کے کام کرتی ہے اس لئے مزاج بھی سخت ہے۔ ذرا دھونس سے رہتی ہے۔ شاید یہ دھونس اس نے دیورانی نرمدا پر بھی چلانے کی کوشش کی تھی تبھی وہ بدک گئی ہوگی۔

وجئے کی نئی نئی شادی ہوئی تھی، تبھی کی بات ہے۔ اس دن میں کھانا کھا کر اٹھی تھی کہ کرن سامنے آ گئی، بولی، 'ایک بات کہوں، میڈم' میں نے کہا، 'کہو'

وہ بولی، 'میڈم، آپ نرمدا کو سمجھاؤ'

'کیا سمجھاؤں؟' میں نے پوچھا۔

'گھر میں بال بچے رہتے ہیں۔ ان پر غلط اثر پڑتا ہے۔' 'کون سا غلط اثر؟' میں نے پوچھا۔

'ارے یہ دونوں دن دہاڑے 'کش' کرتے ہیں۔' کرن نے جب یہ کہا تو مجھے بہت زور کی ہنسی آئی کہ ہاتھ سے پانی کا گلاس چھوٹ گیا اور کرن ہونق سی مجھے دیکھنے لگی۔ اتنے میں میں سنبھل گئی۔ میں نے کرن سے کہا۔ 'ارے نئی نئی شادی ہوئی ہے ان کی۔'

کرن نے ٹوکا 'ہماری کیا شادی نہیں ہوئی تھی۔ پر ہم نے تو ایسے ناٹک کبھی نہ کئے۔'

میں کرن سے کہنا تو بہت کچھ چاہتی تھی کہ بھئی تم جب گھر میں اکیلے تھی تو تم کو پوری آزادی تھی وغیرہ وغیرہ، لیکن مجھے نکلنے کی جلدی تھی تو فالتو میں وقت برباد کرنے کا مطلب بھی نہیں تھا۔

اسی طرح دن گزر رہے تھے۔ کبھی کرن شکایت کرتی کہ نرمدا تو کچھ بھی نہیں کرتی۔ رانی کی طرح پڑی رہتی ہے۔ نہیں تو کانچ کے سامنے کھڑے ہو کر سجتی سنورتی ہے۔ اس کے بالکل برعکس شکایت وجئے کی جانب سے ہوتی۔ 'میڈم، کرن بھابی سارا کام بیچاری نرمدا پر ڈال دیتی ہیں۔ خود بیٹھ کر سیریئل دیکھتی ہیں۔ آپ ذرا بھابی جی کو سمجھانا۔'

پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ وجئے نے بغاوت کر دی اور اعلان کر دیا کہ اب تو دو چولہے ہو کر رہیں گے۔ کرن نے بھی وجئے سے کہہ دیا 'ہاں، دیکھ لو دو چولہے کر کے۔ سب آٹے دال کے بھاؤ پتہ چل جائیں گے۔ تیری عورت تو کسی کام کی نہیں۔ چلی ہے گھر گرہستی چلانے۔ گرہستی چلانا کیا بچوں کا کھیل ہے؟'

میں نے بھی وجئے کو اسی کی زبان میں سمجھایا کہ ابھی ایک ماچس میں دو گرہستی کے چولہے جلتے ہیں۔ الگ رہے گا تو سب کچھ خود کرنا پڑے گا۔ یہاں تو گھر کا کرایا بھی نہیں لگتا، تم کو الگ کمرہ دیکھنا پڑے گا۔ وجئے تو اس بات کو سمجھ رہا تھا لیکن اس کی بیوی ماننے کو تیار نہیں تھی۔ آخر کار وہ الگ ہو گئے۔ پڑوس کے گھر کا ایک گیرج ہی کرائے پر لے لیا اور وہ دونوں اسی میں رہنے لگے۔ لیکن وجئے اور کرن کا جھگڑا بھی عجیب تھا، کبھی ایک دوسرے سے اتنی شدید لڑائی اور کبھی بھرپور میل محبت۔ لیکن مجھے فرصت نہ ملی۔ مجھ سے دونوں ایک دوسرے کی شکایتیں ہمیشہ کیا کرتے۔ اسی بیچ وجئے کی بیوی حاملہ ہوئی۔ دن پورے ہوئے تو اسپتال میں بھرتی ہوئی اور لیڈی ڈاکٹر کی تاریخ سے دو ایک دن آگے پیچھے ڈلیوری ہوئی۔ جیسے ہی ڈاکٹر نے بتایا، لڑکی ہوئی ہے۔ نرمدا خوب روئی۔ وجئے منھ لٹکا کر زچہ کے باہر لگے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ نرمدا کے لئے ٹفن کرن اپنے گھر سے لائی۔ پورے سوا مہینے وجئے اور اس کی بیوی نے بھائی - بھابی کے گھر کھانا کھایا۔ پانچ چھ دن بعد ہی وہ بیٹی کی کارستانیاں ایسے فخر سے بتانے لگا تھا جیسے وہ کوئی جادوئی بچی ہو۔ سات دن کی گڑیا کے لئے وہ کہتا، 'میڈم، چھوکری اتنی بدمعاش ہے، ایسے لپک لپک کے ہاتھ پاؤں مارتی ہے کہ پوچھو مت۔'

گڑیا، اب ہنسنے لگی، اب آنکھ ملانے لگی، اب گھٹنیوں چلنے لگی۔ آج تو پلنگ پکڑ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ گڑیا کی ترقی کی پوری کہانی میرے کانوں میں وجئے کی زبانی درج ہوتی رہی۔ کبھی کبھی وجئے پیسے بچا کر گڑیا کے لئے فراک خریدتا تو کبھی چابی والا بھالو۔

'کیوں رے؟ تجھے روز روز دیر کیوں ہو جاتی ہے؟ کیا کرتا رہتا ہے تو گھر پر؟' وجئے سے میں نے پوچھا تو بولا، 'گڑیا مجھ ہی سے تیار ہوتی ہے۔ میں اس کو نہلاتا ہوں، کپڑے پہناتا ہوں، پتہ ہے میڈم، رات کو اس کی نیند کھلتی ہے تو وہ دودھ بھی مجھ ہی سے مانگتی ہے، اپنی ممی سے نہیں۔' وجئے نے خوشی سے بتایا۔

'اچھا' میں نے کہا 'ایک تو تو صبح دیر سے آتا ہے، پھر رات کو بھی گھر پہنچنے کی جلدی۔ آٹھ بج کر دس منٹ سے کچھ دیر ہو جائے تو اتنی تیز رفتاری سے گاڑی چلاتا ہے کہ لگتا ہے کہ سیدھے اوپر والے کے پاس پہنچا کر ہی دم لے گا۔'

'ہی ہی ہی، میڈم آپ بھی کیا بات کرتی ہیں۔' کہہ کر اس نے اسٹیرنگ چھوڑ کر کان پکڑ لئے۔ گاڑی تھوڑی گھومی تو میں نے کہا، 'ارے آگے دیکھ' اتنے میں ٹریفک سگنل آ گیا تو اس نے گردن گھمائی۔

'میڈم، گڑیا تین سال کی ہونے والی ہے۔ اب اس کو اسکول میں ڈالنا ہے، پرائیوٹ اسکول میں۔ آپ بڑی میڈم سے سفارش کر دیجئے گا۔'

'ہاں، کر دوں گی۔ تو اسپتال سے سرٹیفکٹ تو لا، کلکٹریٹ جا کر پکا برتھ سرٹیفکٹ بنوا۔ یہ سب بھی تو چاہئے۔'

گاڑی آگے بڑھی اور وہ بولا، 'کلکٹر آفس، نا بابا نا،، مجھ سے نہیں بنے گا، آپ ہی کچھ کر دیجئے میڈم!'

'پہلے تو کوشش کر، نہیں تو میں ہوں ہی۔' اپنی بھابی سے کہہ نا، وہ تو سب کرا لاتی ہے۔ اس نے تو اپنے بچوں کے پیدائش کیا، ذات کی اسناد بھی بنوالی ہیں۔ اس کے ساتھ چلے جانا، سب کروا دے گی۔

میرے منھ سے بھابی کے قصیدے سن کر وجئے کا منھ تو اترا لیکن بیٹی کا معاملہ تھا، فوراً سنبھل کر بولا، 'لوں گا، بھابی کا احسان بھی لوں گا۔ بس گڑیا کا ایڈمیشن اچھی جگہ ہو جائے اور کیا۔'

صبح جب گڑیا اٹھتی ہے تو وجئے ہی اسے تیار کرتا ہے۔ نرمدا تو اس وقت چائے بناتی ہے۔ پانی بھرتی ہے پھر وجئے کا ٹفن بناتی ہے اور بھی کئی کام نپٹاتی ہے۔ اسی بیچ گڑیا کی آواز گھر میں گونجتی رہتی ہے۔ پاپا جی، برش کرادو، پاپا جی، نہلا دو، پاپا جی، یہ فراک اچھی نہیں ہے، پاپا جی، جھاکر والی فراک کب لاؤ گے وغیرہ۔ ادھر وجئے بولتا جاتا ہے۔ اچھے سے برش کر گڑیا، کلا کر، دانت چوں چوں بجنا چاہئے، سمجھی؟ ارے رُک، پانی میں ہاتھ مت ڈال دینا، ابھی تیری ممی اسٹوو سے لائی ہے۔ ٹھنڈا ملا لینے دے۔ سچ میں، یہ فراک تو تیرے کس گئی ہے۔ پہلی تاریخ کو روپے ملتے ہی نئی فراک لاؤں گا۔

رات میں گڑیا وجئے کی باہوں میں سر رکھ کر سوتی ہے۔ آدھی رات میں نیند کھلتی ہے تو فوراً وجئے کا ہاتھ ہلا دیتی ہے۔ پاپا جی، دودھ دے دو۔ وجئے نے بچپن میں کبھی دودھ نہیں پیا ہوگا مگر گڑیا کے لئے دودھ وہ ضرور لا کر رکھتا ہے۔

اس دن وجئے بدحواس سا اوپر میرے آفس میں ہی آ گیا۔ وہ بھی دوپہر میں۔

'ارے کیا ہوا وجئے، تم تو اپنی بھابی کے ساتھ کلکٹریٹ گئے تھے، گڑیا کا برتھ سرٹیفکٹ بنوانے؟'

'کہاں بنا؟' وہ تنتا تا ہوا بولا۔ 'میں کہتا تھا کہ کرن بھابی مجھ سے جلتی ہے۔ اسپتال سے جان بوجھ کر غلط سلط کاغذ لکھالائی تاکہ میری گڑیا اچھے اسکول میں ایڈمیشن نہ لے سکے۔ کلکٹریٹ والوں نے کہا کہ تم لوگ کہہ رہے ہو کہ لڑکی کے کاغذ بنوانا ہیں لیکن اسپتال کے کاغذ میں تو لڑکا لکھا ہے۔'

'ارے تو بھئی، تھوڑا اطمینان رکھ، اسپتال والوں سے برتھ سرٹیفکٹ بنانے میں تھوڑی لاپروائی ہوگئی ہوگی۔ تیری بھابی ایسا کیوں کرے گی، ذرا سوچ۔ اچھا چل، میں اسپتال میں فون کر کے سیدھے ڈاکٹر آرتی سے بات کرتی ہوں۔' میں نے کہا۔

مگر اسپتال کی لاپروائی کی بات سن کر وجئے کا دماغ پوری طرح گھوم چکا تھا۔ وہ ایک انہونی بات بول پڑا۔ 'تو اس کا مطلب میرے یہاں لڑکا ہوا تھا۔ میں جا کر لڑوں گا اسپتال والوں سے کہ میرا لڑکا واپس کرو، لڑکی لے جاؤ۔'

'وجئے تم کیسی بات کر رہے ہو؟ تم گڑیا کو کتنا چاہتے ہو؟ تم ایسی بات کیسے کر سکتے ہو؟ تم نہیں جانتے کہ گڑیا کی شکل تم سے کتنی ملتی ہے؟' مگر یہ سننے سے پہلے وجئے بھنا کر وہاں سے نکل گیا، بولتا ہوا گیا۔ گھر جا کر بھانگ کھا کر سوؤں گا۔ پھر کل دیکھتا ہوں، اسپتال والوں کو۔

میں نے ڈاکٹر آرتی کو فون کیا تو انہوں نے کہا کہ وہ ابھی شہر کے باہر ہیں۔ برتھ رجسٹر دیکھنے والے شکلا جی بھی چھٹی پر ہیں۔ کل لوٹ آئیں گے۔ انہوں نے کہا کہ انہیں یاد ہے کہ نرمدا کو لڑکی ہوئی تھی اور اس لئے کچھ زیادہ اچھی طرح یاد ہے کہ لڑکی سن کر نرمدا خوب روئی تھی تو وہ خود نرسوں کے ساتھ اسے سمجھانے آئی تھیں۔ ڈاکٹر آرتی مزید بولیں، ابھی جونرس ڈیوٹی پر ہے، وہ ذرا کچی ہے۔ ضرور اس نے کچھ غلطی کر دی ہوگی اور اس لاپروائی کے لئے میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔

دوپہر سے بھانگ کھا کر سونے کی وجہ سے رات سات بجے ہی وجئے کی نیند کھل گئی۔ اب وہ یونہی تکئے پر سر رکھ کر چھت کو گھور رہا تھا۔ گڑیا نے پوچھا، پاپا جی، فراک کب لاؤ گے۔ اس نے کچھ جواب نہیں دیا۔ گڑیا نے اس کی بانہہ پر سر رکھا تو اس نے اس کا سر ہٹا کر تکئے پر رکھ دیا۔ گڑیا رونے لگی لیکن وجئے نے کروٹ لے لی۔ نرمدا ساری بات سمجھ رہی تھی۔ اس نے گڑیا کو گود میں اٹھایا، اس کے آنسو پونچھے اور تھپکی دے کر سلا دیا۔ گڑیا بچکی لیتے لیتے سو گئی۔

صبح گڑیا برش پر پیسٹ لگانے کے لئے سہمی سی نظر سے وجئے کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن وہ کہیں اور دیکھ رہا تھا۔ اس نے زور سے پیسٹ دبایا اور خوب سارا پیسٹ برش پر لگایا اور برش کر لیا۔ برش کرنے کے بعد اس نے دانت بجا کر اور وجئے کو خوش کرنے کی غرض سے کہا، دیکھو پاپا جی، دانت چوں چوں کر رہے ہیں لیکن وہ خاموش رہا۔ الٹے نرمدا پر چلایا۔ دنیا میں کیا عورتیں کھانا نہیں بناتیں، پانی نہیں بھرتیں کیا، تو ہی انوکھی ہے کیا جو صبح صبح مجھ سے کام کرواتی ہے، روز دیر ہو جاتی ہے۔ آج میں پہلے نہاؤں گا۔ پھر گڑیا کو نہلاتی رہنا۔

وجئے نہا کر تیار ہو گیا۔ رات کو اس نے کھانا نہیں کھایا تھا، اس لئے دو روٹی ٹھونس لی۔ وہ نکلنے کو تیار تھا اسی درمیان نرمدا گڑیا کے لئے باتھ روم میں پانی رکھ آئی تھی کہ وہ اسے نہلا دے گی۔ تولیہ لینے باہر آئی تو اسی بیچ گڑیا کی چیخ سنائی دی۔ وجئے اور نرمدا دونوں دوڑے۔ گڑیا نے غلطی سے ابلتے پانی میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ یہ دیکھ کر وجئے کی حالت خراب ہو گئی۔ اس نے لپک کر گڑیا کو گود میں اٹھا لیا۔ وجئے کی آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری تھے۔ وہ خود سے بولا، 'ہے بھگوان، یہ میں نے کیا کر دیا۔ مجھے معاف کر دینا۔'

اس کی گود میں چڑھی گڑیا، اس کے آنسو پوچھ رہی تھی۔ پاپا جی، کیوں رو رہے ہو؟ پاپا جی، مت رو اور وہ گڑیا کو لے کر پورچ کی طرف بھاگ رہا تھا۔ میں باہر نکلی ہی تھی، اس پر نظر پڑی تو میں نے اسے بتایا کہ ڈاکٹر آرتی سے میری بات ہو گئی ہے۔ اس کو لڑکا نہیں ہوا تھا۔ رجسٹر میں لڑکی ہی لکھی ہوئی ہے۔ گڑیا تیری ہی بیٹی ہے وجئے۔ میں نے کہا تو اس نے گڑیا کو اپنی گود میں پیار کرتے ہوئے کہا، 'اور کس کی ہوگی میڈم، میری ہی ہے۔' وجئے کے آنسو ابھی بھی بہہ رہے تھے۔ اتنے میں کرن کے گھر کی طرف سے نرمدا اور کرن دوڑتی ہوئی پورچ کی طرف آتی دکھائی تھیں۔ کرن کے ہاتھ میں برنال کی ٹیوب تھی۔ کرن نے آہستہ سے گڑیا کا ہاتھ اٹھایا اور کریم لگانے لگی تو گڑیا یکا یک بولی، 'پاپا جی سے لگواؤں گی۔'

□□□

جان گالزوردی

۱۸۶۷ ۱۹۳۳

ٹیلر ماسٹر

میں اسے تب سے جانتا تھا، جب میں بہت چھوٹا تھا۔ وہ میرے ابو کے کپڑے سلتا تھا۔ چھوٹی سی ایک گلی میں دو دکانیں ملا کر انھیں ایک دکان میں کر دیا گیا تھا۔ مگر اب وہ دکان نہیں رہی، اس کی جگہ ایک بیحد جدید طرز کی دکان تیار ہوگئی ہے۔

اس کی کاریگری میں کچھ خاص بات تھی۔ شاہی خاندان کے لیے تیار کیے گئے کسی بھی سوٹ پر کوئی نشان نہیں ہوتا تھا سوائے ان کے اپنے جرمن نام کے ''گیسلر بردرس'' اور کھڑکی پر چند شٹروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ مجھے یاد ہے کھڑکی پر ایک ہی طرح کی کپڑوں کو بار بار دیکھنا مجھے کھلتا تھا، کیوں کہ وہ آرڈر کے مطابق ہی کپڑے سلتا تھا۔ نہ کم نہ زیادہ۔ اس کے سلے ہوئے کپڑے کے بارے میں یہ سوچنا غیر تصوراتی تھا کہ وہ جسم میں ٹھیک سے فٹ نہیں ہوں گے؟ تو کیا کھڑکی پر رکھی ہوئی شرٹیں اس نے خریدی تھیں۔ یہ سوچنا بھی بعید از قیاس تھا۔ واقعی وہ ایک بہترین درزی تھا اور کپڑے اس طرح سلتا تھا جیسے تمام کپڑوں کی روح اس میں منتقل ہوگئی ہو۔

دراصل یہ سارے خیالات میرے ذہن پر بعد میں ابھرے۔ حالانکہ جب میں صرف چودہ برس کا تھا، تب سے اسے جانتا تھا اور اسی وقت سے میرے دل میں اس کے اور اس کے بھائی کے لیے احترام کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ مجھے بخوبی یاد ہے، ایک دن میں نے ایک ٹائی کے لئے اپنا چھوٹی سی گردن آگے بڑھا کر شرماتے ہوئے اس سے پوچھا تھا، ''مسٹر! کیا یہ بہت مشکل کام نہیں ہے؟'' جواب دیتے وقت سرخی مائل داڑھی سے ایک مسکان ابھر آئی تھی، ''ہاں، یہ مشکل کام ہے۔''

چھوٹے قد کا وہ آدمی جیسے بذات خود مخملی کپڑے سے بنایا گیا ہو، اس کا زرد چہرہ جھریوں بھرا چہرہ اور سرخی مائل گھنگھرالے بال اور داڑھی، رخساروں سے اس کے منہ تک دائروی شکل میں ابھری چہرے کی لکیریں، گلے سے نکلی ہوئی بھاری بھرکم آواز۔ کپڑا ایک نافرمان چیز ہے۔ ملائم اور آہستہ آہستہ شکل میں آنے والیچیز۔

اس کا بڑا بھائی بھی تقریباً اس جیسا ہی تھا، بلکہ اس کا رنگ کچھ زیادہ زردی مائل تھا۔ شروعات میں میرے لیے دونوں میں فرق کر پانا دشوار مرحلہ تھا۔ پھر میری سمجھ میں آ گیا۔

کئی بار برسوں بیت جاتے اور بل میں اضافہ ہوتا جاتا، مگر گیسلر بھائیوں کی رقم کوئی ادھار نہیں رکھتا تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ اس نیلے فریم کے چشمے والے درزی کی کسی پر دو سوٹ سے زیادہ رقم باقی ہو۔ اس کے پاس جانا ہی طمانیت کا احساس جگا دیتا تھا کہ ہم بھی اس کے گاہک ہیں۔ وہاں جانا کسی عام دکان پر خریداری کرنے کے مترادف نہیں تھا۔ ایسا قطعی نہیں تھا کہ آپ دکان میں داخل ہوئے اور بس کہنے لگیں کہ، ''ذرا مجھے یہ دکھاؤ'' یا ''ٹھیک ہے'' کہہ کر اٹھے اور چل دیئے۔ یہاں پورے اطمینان کے ساتھ جانا پڑتا تھا، بالکل اسی طرح جیسے کسی گرجا گھر میں داخل ہوا جاتا ہے۔ پھر اس کی اکلوتی لکڑی کی کرسی پر بیٹھ کر انتظار کریں، کیوں کہ اس وقت وہاں کوئی نہیں ہوتا۔ جلدی ہی مختلف طرح کے نئے کپڑوں کی بھینی بھینی بو اور تاریکی سے بھری اوپر کی کنوئیں نما کوٹھری سے اس کا یا اس کے بڑے بھائی کا چہرا نیچے جھانکتا ہوا نظر آتا۔ ایک بھاری بھرکم آواز اور لکڑی کی تنگ سیڑھیوں سے قدموں کی چاپ سنائی دیتی۔ پھر وہ آپ کے سامنے کھڑا ہوتا، بنا کوٹ کے تھوڑا جھکا جھکا سا، چمڑے کا ایپرن پہنے، آستین اوپر چڑھائے، آنکھیں اور پلکیں جھپکاتے ہوئے۔ میں اس سے پوچھتا، کیسے ہو بھائی گیسلر؟ کیا تم میرے لیے اس کاٹن کے کپڑے سے ایک شرٹ سل دو گے؟

بنا کچھ کہے وہ دکان کے اندر چلا جاتا اور میں اسی لکڑی کی کرسی پر آرام سے بیٹھ کر اس کے پیشے کی بو اپنی سانسوں میں اتارتا رہتا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ

انگریزی کے بہترین افسانہ نویس اور ناول نگار جنہیں 'دَ فورسائٹ ساگا' کے لیے نوبل انعام سے نوازا گیا۔ ان کے سترہ ناول، چھبیس ڈرامے اور افسانے بارہ جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ انگریزی نثر کے علاوہ انہوں نے متعدد نظمیں بھی کہی ہیں۔ ان کی مشہور تصانیف میں دَ آئی لینڈ فیری سیز، دَ مین آف پراپرٹی، دَ ڈارک فلور، اِن چانسری، ٹولیٹ، لائلٹیز، دَ وہائٹ سنکی، دَ سلور باکس وغیرہ شامل ہیں۔ پیش ہے **جان گالزوردی** کی کہانی 'درزی' جس کا اردو ترجمہ **'قاسم ندیم'** نے کیا ہے۔

بشکریہ اردو چینل

لوٹتا۔ اس کے کمزور اور اُبھری ہوئی نسوں والے ہاتھوں میں گہرے بھورے رنگ کے کپڑے کا ایک ٹکڑا ہوتا۔اس کی آنکھیں اس پر گڑی رہتیں اور وہ کہتا،''کتنا خوبصورت کپڑا ہے!''جب میں بھی اس کی تعریف کردیتا تو وہ سوال کرتا،آپ کو شرٹ کب تک چاہیے؟''اور میں کہتا،''اوہ، بنا کسی دقت کے جتنی جلد ممکن ہوسکے سل کردے دو۔''اور پھر وہ سوالیہ انداز میں کہتا،''کل دوپہر؟''یا اگر اس کا بڑا بھائی ہوتا تو وہ کہتا،''میں اپنے بھائی سے پوچھوں گا۔''

پھر میں آہستہ سے کہتا،''شکریہ مسٹر گیسلر،اب اجازت،خداحافظ۔''

''خدا حافظ!''وہ کہتا۔مگر اس کی نگاہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے کپڑے کے اسی ٹکڑے پر ہی ٹکی رہتیں۔میں دروازے کی جانب مڑتا۔مجھے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی۔جو اسے کپڑوں کی اسی خوابوں بھری دنیا میں لے جاتی۔مگر ایسی کوئی نئی ڈزائن بنوانی ہو جو اس نے ابھی تک میرے لیے نہ بنایا ہو تو وہ جیسے مخمصے میں پڑ جاتا۔دیر تک ہاتھ میں لے کر اس کپڑے کو دیکھتا رہتا۔مسلسل شفقت بھری پارکھی نظروں سے نہارتا رہتا۔جیسے اس گھڑی کو یاد کرنے کی کوشش کررہا ہو جب بڑے جتن سے انھیں بنایا گیا تھا۔اس کے ہاؤ بھاؤ میں کرب جھلکتا تھا کہ آخر کس نے اس قدر عمدہ نمونے کو اس حال میں پہنچایا ہے۔پھر کاغذ کے ایک ٹکڑے پر میرا پیپر رکھ کر وہ پنسل سے دو تین لکیریں کھینچتا،اس کی حرکت کرنے والی انگلیاں میرے کندھوں اور ہاتھوں کو چھوتی رہتیں،جیسے میں نے یوں ہی اس سے کہہ دیا،''بھائی گیسلر،آپ کو پتہ ہے،آپ نے جو پچھلی شرٹ سل کردی تھی وہ کچھ ٹائٹ ہے۔''

کچھ کہے بغیر اس نے پل بھر میری طرف دیکھا،جیسے امید کررہا ہو کہ یا تو میں اپنا جملہ واپس لے لوں یا اپنی بات کا ثبوت پیش کروں۔

''ایسا تو نہیں ہونا چاہیے تھا۔''وہ بولا۔

''ہاں مگر ایسا ہوا ہے۔''

یہ سن کر اس نے اپنی نظریں جھکالیں۔جیسے وہ اسے کو یاد کرنے کی کوشش کررہا ہو،مجھے بے حد افسوس ہوا کہ میں نے یہ بات کیوں کہہ دی۔

'شرٹ واپس بھیج دو،میں دیکھوں گا۔'وہ بولا۔

اپنی ٹائٹ شرٹ کے بارے میں میرے اندر رحم دلی کے جذبات ابھر آئے۔میں بخوبی تصور کرسکتا تھا کہ دکھ بھری طویل بے چینی کے ساتھ نہ جانے کتنی دیر تک وہ اس کی فٹنگ کرے گا؟

''کچھ کپڑے۔''اس نے آہستگی سے کہا،''پیدائشی خراب ہوتے ہیں،اگر اسے درست نہ کرسکا تو آپ کے بل میں اس کے پیسے نہیں جوڑوں گا۔''

اک بار محض ایک ایک بار میں اس کی دکان میں بے خیالی سے ایسی شرٹ پہن کر چلا گیا جو جلد بازی کی وجہ سے کسی مشہور دکان سے خریدی ہوئی تھی۔اس نے بنا کوئی چھڑا دکھائے میرا آرڈر لے لیا۔میری شرٹ پر اس کی آنکھیں ٹکی ہوئی تھیں۔میں اس بات کو محسوس کررہا تھا۔آخر اس سے رہا نہ گیا اور وہ بول اٹھا،''یہ میری سلی ہوئی شرٹ تو نہیں ہے؟''

اس کے لہجے میں نہ غصہ تھا نہ دکھ کا اظہار نہ نفرت کے جذبات۔مگر کچھ ایسا ضرور تھا،جو لہو کو سرد کردے۔اس نے کالر کے اندر کی طرف ہاتھ ڈال کر انگلی سے ایک جانب زور دیتے ہوئے کہا،

''یہاں،یہ آپ کو کاٹتی ہے نا؟''اس نے پوچھا،''یہ جو بڑی کمپنیاں ہیں انھیں عزت کا پاس نہیں ہوتا۔''پھر جیسے اس کے دماغ میں کچھ بیٹھ گیا ہو،وہ زور زور سے کڑواہٹ بھرے لہجے میں بولنے لگا۔یہ پہلی مرتبہ تھا،جب میں نے اسے اپنے پیشے سے پیدا ہونے والے ناگفتہ بہ حالات اور دقتوں کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے سنا۔''انھیں سب کچھ حاصل ہوجاتا ہے۔''اس نے کہا،''وہ کام کے بوتے پر نہیں،بلکہ اشتہار کے بوتے پر سب کچھ حاصل کرلیتے ہیں۔وہ ہمارے گاہک چھین لیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ آج میرے پاس کام نہیں ہے۔''

اس کی جھریوں سے بھرے چہرے پر میں نے وہ سب دیکھا جو کبھی نہیں دیکھا تھا۔بے انتہا تکلیف، کڑواہٹ اور جدوجہد،اچانک اس کی سرخ مائل داڑھی میں سفیدی لہرانے لگی تھی۔

اپنی جانب سے میں اتنا کرسکتا تھا کہ اسے حالات سے روشناس کراتا جس کی بنا پر میں اس گھٹیا شرٹ کو خریدنے پر مجبور ہوگیا تھا۔مگر ان چند لمحات میں اس کے چہرے اور آواز نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ میں نے کئی شرٹ سلنے کا آرڈر دے دیا اور اتفاق سے پھر تقریباً دو برس تک میں وہاں نہ جاسکا۔

آخر جب میں گیا تو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ اس کی دکان کی دو چھوٹی کھڑکیوں میں سے ایک کھڑکی کے باہر کسی دوسرے کے نام کا بورڈ آویزاں ہوگیا تھا۔وہ بھی درزی ہی تھا۔شاہی خاندان کے لباس۔اب صرف ایک کھڑکی پر وہی جانی پہچانی سی شرٹیں رکھی ہوئی تھیں۔اندر بھی،دکان کی وہ کنوئیں نما کوٹھری پہلے کی بہ نسبت زیادہ تاریک اور بو سے اٹی ہوئی لگ رہی تھی۔اس بار ہمیشہ سے کچھ زیادہ ہی وقت لگا۔کافی دیر بعد وہی چہرہ نیچے جھانکتا ہوا دکھائی دیا۔پھر چپلوں اور قدموں کی آواز گونجنے لگی۔آخر وہ میرے روبرو تھا، زنگ آلود ٹوٹے پرانے چشمے میں سے جھانکتا ہوا۔اس نے پوچھا،''آپ مسٹر.....ہیں نا؟''

''ہاں مسٹر گیسلر۔''میں نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا،''کیا بتلاؤں،آپ کی شرٹوں کی فٹنگ کچھ ایسی تھی کہ انہیں ریجکٹ کرنے کا دل ہی نہیں چاہتا اور یہ ابھی تک میرے استعمال میں ہیں۔اس نے انھیں دیکھا۔

''ہاں۔''وہ بول اٹھا۔''مگر لگتا ہے لوگوں کو اب فٹنگ کی ضرورت نہیں رہی۔''

اس کی طنز بھری نظروں اور آواز سے نجات پانے کے لیے میں نے فوراً کہا،''یہ تم نے اپنی دکان کو کیا کر ڈالا ہے؟''۔اس نے اطمینان سے کہا،''بہت

مہنگا پڑ رہا تھا۔ کیا آپ شرٹ سلوانا ہے؟''

میں نے تین چار شرٹوں کا آرڈر دیا۔ حالانکہ مجھے ضرورت صرف دو شرٹوں کی ہی تھی اور جلدی سے میں وہاں سے باہر نکل آیا۔ مگر پھر ایسا ہوا کہ میں کئی مہینوں تک وہاں نہیں گیا۔ جب میں وہاں گیا تو میرے ذہن میں بس یہی خیال تھا، اوہ! میں بھلا اس بوڑھے کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ شاید اس بار اس کے بڑے بھائی سے سامنا ہو جائے۔

میں جانتا تھا کہ اس کا بڑا بھائی تیکھے لہجے میں یا نفرت آمیز لہجے میں بات نہیں کر سکتا۔ واقعی دکان میں جب مجھے بڑے بھائی کی شبیہ دکھائی دی تو میں نے راحت محسوس کی۔ وہ کپڑے سلنے میں مصروف تھا۔

''ہیلو مسٹر گیسلر کیسے ہیں آپ؟'' میں نے پوچھا۔ وہ اٹھا اور غور سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے آہستگی سے کہا، ''مگر میرے بڑے بھائی کا انتقال ہو گیا۔''

تب میں نے دیکھا کہ یہ تو وہ خود تھا۔ کتنا بوڑھا اور کمزور ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اسے اپنے بڑے بھائی کا ذکر کرتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں نے آہستہ سے کہا، 'یہ تو بہت ہی برا ہوا'

''ہاں۔'' وہ بولا، ''وہ نیک دل انسان تھا، اچھے کپڑے سلتا تھا مگر اب وہ نہیں رہا۔'' پھر اس نے اپنے سر پر ہاتھ رکھا، جہاں سے اچانک اس کے بہت زیادہ بال جھڑ گئے تھے۔ اس کے بدقسمت بھائی کی طرح۔ مجھے محسوس ہوا شاید وہ اس طرح اپنے بھائی کی موت کا سبب بتا رہا تھا۔ 'بھائی اس دوسری دکان کو کھو دینے کا غم برداشت نہیں کر پایا۔ خیر، کیا آپ کو کپڑے سلوانے ہیں؟'

میں نے سوٹ کا آرڈر دیا۔ بہت دنوں بعد مجھے وہ سوٹ ملے جو بیحد شاندار تھے۔ انھیں بڑے سلیقے سے پہنا جا سکتا تھا۔ اس کے بعد میں بیرون ملک چلا گیا۔

لوٹ کر لندن آنے میں ایک برس سے بھی زیادہ وقت گزر گیا۔ لوٹنے کے بعد سب سے پہلے میں اپنے اسی بوڑھے دوست کی دکان پر گیا۔ میں جب گیا تھا وہ ساٹھ برس کا تھا۔ اب جسے میں دیکھ رہا تھا وہ پچہتر سے بھی زیادہ کا دکھائی دے رہا تھا۔ بھوک سے بے حال، تھکا ہوا، خوفزدہ اور اس بار واقعی اس نے مجھے نہیں پہچانا۔

''اور مسٹر گیسلر۔'' میں نے کہا۔ دل ہی دل میں دکھی تھا، ''تمہارے سوٹ تو واقعی کمال کا ہے! دیکھو، میں بیرونِ ملک بھی یہی پہنتا تھا۔

بڑی دیر تک وہ جوتوں کو دیکھتا رہا۔ روسی کپڑوں سے سلا ہوا سوٹ۔ اس کے چہرے پر ایک چمک سی لوٹ آئی۔

'کیا آپ کو کچھ سلوانا ہے؟' اس نے پوچھا، 'میں جلد ہی سل کر دوں گا، یوں بھی مندی کا دور چل رہا ہے۔'

'میں بالکل نئے طرز کے کپڑے سلوں گا۔' اور اس کی نگاہوں نے میرے جسم کو ٹٹولا۔ اس دوران صرف ایک بار اوپر دیکھ کر وہ بولا، ''کیا میں نے آپ کو بتایا کہ میرے بھائی کا انتقال ہو گیا ہے؟''

اسے دیکھنا بڑا تکلیف دہ تھا، وہ بہت کمزور ہو گیا تھا، باہر آ کر میں نے راحت محسوس کی۔

میں ان کپڑوں کی بات بھول ہی چکا تھا کہ ایک شام اچانک وہ آ پہنچے۔ جب میں نے پارسل کھولا تو ایک کے بعد ایک چار سوٹ نکلے۔ سائز، فٹنگ، کولائی غرض کہ ہر لحاظ سے اب تک سلے گئے سارے کپڑوں سے بہتر اور لاجواب۔ کپڑوں کے درمیان مجھے اس کا بل ملا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح ہی دام لگایا تھا۔ مگر مجھے تھوڑا دھکا لگا۔ کیونکہ وہ کبھی ماہ کی آخری تاریخ سے قبل بل نہیں بھیجتا تھا۔ میں دوڑتے ہوئے نیچے گیا، چیک بنایا اور فوراً پوسٹ کر دیا۔ ایک ہفتے بعد میں اس راستے سے گزر رہا تھا تو سوچا کہ اسے جا کر بتاؤں کہ اس کے سوٹ کتنے شاندار اور بہترین ناپ کے بنے ہیں۔ مگر جب میں وہاں پہنچا جہاں اس کی دکان تھی تو اس کا نام غائب تھا۔ کھڑکی پر اب بھی وہی سلیقہ والی شرٹیں رکھی ہوئی تھیں۔ بے چین ہو کر میں اندر گیا، دونوں دکانوں کو ملا کر دوبارہ ایک دکان کر دی گئی تھی۔ ایک انگریز نوجوان ملا۔ ''مسٹر گیسلر اندر ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ اس نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔

'نہیں سر۔' وہ بولا، 'نہیں، مسٹر گیسلر نہیں ہیں مگر ہم ہر طرح سے آپ کی خدمت کر سکتے ہیں، یہ دکان ہم نے خرید لی ہے، آپ نے باہر ہمارا بورڈ دیکھا ہوگا۔ ہم نامی گرامی لوگوں کے لیے کپڑے سلتے ہیں۔'

''ہاں، ہاں۔'' میں نے کہا، ''مگر مسٹر گیسلر؟''

''اوہ!'' وہ بولا، ''ان کا انتقال ہو گیا۔''

''کیا، انتقال ہو گیا؟ مگر انھوں نے مجھے پچھلے ہفتے ہی تو یہ سوٹ بھیجے تھے۔''

''اوہ! بے چارہ بوڑھا، بھوک سے ہی مر گیا۔'' اس نے کہا۔ ''بھوک سے آہستہ آہستہ موت، ڈاکٹر یہی کہتے ہیں! آپ جانتے ہیں وہ دن رات بھوکا رہتا تھا اور کام کرتا تھا۔ اپنے علاوہ کسی کو بھی کپڑوں پر ہاتھ لگانے نہیں دیتا تھا۔ جب اسے آرڈر ملتا تو اسے پورا کرنے میں رات دن ایک کر دیتا۔ اب لوگ بھلا کیوں انتظار کرنے لگے۔ اس کے سبھی گاہک چھوٹ گئے تھے۔ وہ وہاں بیٹھا لگاتار کام کرتا رہتا۔ وہ کہتا کہ پورے لندن میں اس سے بہتر کپڑے کوئی نہیں سلتا۔ خیر! چھوڑیئے اس طرح کے آدرش میں کیا رکھا ہے۔''

''مگر بھوک سے مرجانا؟''

''یہ بات عجیب سی لگتی ہے مگر میں جانتا ہوں دن رات اپنی آخری سانس تک وہ کپڑوں پر لگا رہا۔ انھیں دیکھتا رہتا۔ اسے کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہتا تھا۔ جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی۔ سب کچھ گروی رکھ دیا تھا۔ مگر اس نے کپڑا نہیں چھوڑا۔ نہ جانے کس طرح وہ اتنے دن زندہ رہا۔ وہ مسلسل فاقے کرتا رہا۔ وہ ایک عجیب انسان تھا، مگر ہاں، وہ کپڑے بہت عمدہ سلتا تھا۔''

''ہاں۔'' میں نے کہا، ''وہ ایک بہترین درزی تھا۔''

□□□

مہانگری

راجندر مشر

شملہ، ہماچل پردیش

مہانگری، بمبئی سے بنارس کے درمایں روزانہ چلنے والی ایک مشہور ٹرین

اس گاڑی کے راستے میں الٰہ آباد، ستنا، کٹنی، جبل پور، نرسنگھ پور، اٹارسی، کھنڈوہ، بھساو، ناسک وغیرہ شہر آتے ہیں۔ ان شہروں سے گزار کر یہ ٹرین مہانگر پہنچتی ہے۔

میں اس مہینے کے پہلے ہفتے میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ پوتر تیرتھ استھان پریاگ راج جانے کے لئے بمبئی سے اس ٹرین میں سوار ہوا۔ یہ گاڑی آدھی رات کے وقت وکٹوریہ ٹرمینس (وی ٹی) سے چلتی ہے۔ میں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ ملاڈ سے چرچ گیٹ اور چرچ گیٹ سے وی ٹی کے لئے نکلا۔ اس وقت گاڑی چھوٹنے میں صرف دس منٹ رہ گئے تھے مگر مجھے کسی قسم کی گھبراہٹ نہیں تھی کیونکہ ہماری برتھ ریزرو تھی۔ ٹرین کے وقت سے دو منٹ پہلے ہم اپنے ڈبے میں اپنی سیٹ تک پہنچ کر اس پر قابض ہو چکے تھے۔

اسٹیشن کا عجیب وغریب منظر

ایک طرف گاؤں سے ممبئی آکر بسنے والی عورتوں اور ان کے رشتہ داروں کا ہجوم تھا جو اپنی بیٹی کو سسرال رخصت کرنے آئے تھے۔ کہیں ان نوجوانوں کا ہجوم تھا جو تعطیلات میں ڈھیر ساری سڑکوں، بہت ساری منزلوں والی عمارتوں سے جگمگاتی ممبئی کی سیر کرنے آئے تھے اور اب اپنے اپنے گاؤں لوٹ رہے تھے۔ ان کے دوست احباب، رشتے دار ان سے کہہ رہے تھے۔

'یہ ساڑی اپنی ماں کو دینا'

'یہ اونی شال اپنے چاچا کو تحفۃً دینا'

'بھینس باندھنے کی یہ زنجیر گھریلو ملازم کھلاون کو دینا'

'ممبا دیوی کا پرساد سب لوگوں میں تقسیم کرنا'

چند لوگ ایسے تھے جو انہیں نصیحتیں کر رہے تھے، سمجھا رہے تھے۔

'کھاتے پیتے ہوئے جانا'

سنسکرت زبان کے مشہور ادیب ابھی راج 'راجندر مشر' بہترین افسانہ نویس، ڈرامہ نگار اور ناول نگار تھے۔ انہوں نے صرف سنسکرت ہی نہیں بلکہ ہندی، انگریزی اور بھوج پوری زبانوں میں بھی متعدد کتابیں تحریر کی ہیں۔ ۱۹۸۸ء میں ان کی کہانیوں کے مجموعے 'اکشوگندھا' پر انہیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ انہیں اتر پردیش سنسکرت سنستھان کی جانب سے وشو بھارتی اعزاز سے بھی سرفراز کیا چکا ہے۔ پیش ہے ان کی مشہور کہانی **'مہانگری'** جس کا اردو ترجمہ **ڈاکٹر بانو سرتاج** نے کیا ہے۔

'کھڑکی کے باہر سر مت نکالنا'

'اپنی چیزوں کا خیال رکھنا'

'کسی کا دیا ہوا کچھ بھی مت کھانا'

آنکھوں میں آنسو لئے بیٹے، بھائی، بھانجوں کا گروپ ان کو رخصت کرنے والے بڑے بزرگوں کا گروپ، آہ بھرتا ہوا، ہائے، سسکیاں، چیخ پکار سے اسٹیشن گونج رہا تھا۔ اسی وقت مہانگری آہستہ آہستہ رینگنے لگی اور کہانی میں جیسے موڑ آتا ہے ویسے ہی کال سرپنی کی طرح وہ ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

گاڑی کے چلتے ہی مسافر ایک دوسرے سے تعارف حاصل کرنے لگے۔ ٹکٹ چیکر آ گیا۔ ٹکٹوں کی جانچ کرنے لگا۔ وہ گیا تو میں اپنے کام میں لگ گیا۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد سے میری آنکھیں مسلسل کھڑکی کے پاس والی سیٹ پر مرکوز تھیں۔ اس پر ایک شخص اپنی بیوی اور تین بچوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اوپر کی برتھ پر شام کے کبوتروں جیسی آنکھوں اور سفید پھولوں جیسے دانتوں والی، برسات میں جابجا اگنے والے شفاف کلرمتوں جیسے نازک بدن والی، پرسکون برف کی طرح پاکیزہ خدوخال والی لڑکی میری طرف رخ کئے ہوئے لیٹی تھی۔ بعد میں گفتگو کے دوران علم ہوا کہ وہ سامنے والی عورت کی بھتیجی ہے اور اس کا نام سنگیتا ہے۔ اس عورت نے کئی مرتبہ سنگیتا کہہ کر اسے پکارا تھا۔

گھریلو عورتیں سفر کرتے وقت ضرورت کی تمام چیزیں لے کر چلتی ہیں۔ کھانے اور ناشتہ کی چیزیں مع چٹنی اور اچار کے، پینے کا پانی، یہاں تک کہ ہاضمہ کی گولیاں بھی۔ چھوٹی بری ٹوکری میں ڈھیروں چیزیں۔ عورتیں ان چیزوں کی نمائش بھی کرتی رہتی ہیں۔ تمام چیزیں استعمال میں آرہی ہیں یا نہیں، یہ دیکھنا ان کا مقصد نہیں ہوتا بلکہ مقصد ہوتا ہے کہ آس

پاس بیٹھی لپ اسٹک پاؤڈر والی فیشن ایبل عورتوں کو یہ جتلانا کہ دیکھو، خاتون خانہ ایسی ہوتی ہے۔ کھانے کے وقت مختلف چیزیں نکال کر بچوں کو دیتے ہوئے ان کا انداز کچھ ایسا ہوتا ہے جیسے کہہ رہی ہوں، دیکھو گلیوں میں گھومنے والے سپیرو، دیکھو، میں کیا لائی ہوں؟

بہر حال تیس برس کی عمر والی وہ دیہاتی بہو کافی خوبصورت تھی۔ سر پر آنچل جما ہوا تھا، کمر میں چاندی کی تگڑی پہنے ہوئے وہ عورت نوجوانوں کی توجہ کا مرکز تھی۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑا لگ بھگ پانچ سال کا، دوسرا دو سال کا اور تیسرا چھ سات مہینے کا تھا۔ دونوں چھوٹے بچے دودھ پینے والے تھے۔ جب وہ چھوٹے کو دودھ پلاتی تو دوسرا رونے لگتا۔ وہ آخر کو منجھلا بچہ تھا۔ چھوٹا بچہ ماں کی گود میں دنیا جہان سے بے خبر دبکا پڑا رہتا۔ منجھلا بچہ پھر اپنی املی کے بیج جیسی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے دوسرے مسافروں کو تکنے لگتا۔ وہ ہمیشہ جھنجھلایا، کھسایا ہوا نظر آتا۔

اس عورت کا شوہر چوراہے کے سانڈ کی طرح خاموش بیٹھا لگاتار کچھ چبائے جا رہا تھا۔ یہ سلسلہ تب سے جاری تھا جب سے گاڑی نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ کبھی پان، کبھی مونگ کی دال، کبھی مونگ پھلی اور کبھی خوشبودار سپاری کے پھکے ہوئے، کسی کی بھی طرف نہ دیکھتے ہوئے دیکھ کر بھی وہ اس کی مدد نہیں کر رہا تھا اور بے نیازی سے اپنے شغل میں مصروف تھا۔ اس کے اس روئے کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہوئے مسافر ایک دوسرے کو آنکھوں آنکھوں میں اشارے کر رہے تھے۔

چھوٹے بچے نے کپڑے گیلے کر دئے تھے۔ عورت نے بھتیجی کو پکار کر رہا، 'سنگیتا، چھوٹے نے کپڑے گیلے کر دئے ہیں۔ اس کے کپڑے دینا ذرا'

اوپر کی برتھ سے نیچے جھک کر سنگیتا نے ٹوکری اٹھائی اور دھلا ہوا نیکر نکال کر اپنی پھوپھی کو پکڑا دیا۔ عورت نے بچے کے گیلے کپڑے اتار کر ایک طرف ڈال دئے۔ پھر شیشی سے سرسوں کا تیل نکال کر بچے کے جسم کی ہلکی سی مالش کی۔ آنکھوں میں کاجل لگایا۔ ماتھے پر داہنی طرف کاجل کا ٹیکہ لگایا تاکہ اس کے لال کو کسی کی نظر نہ لگے۔ پھر اونی کپڑے جو سمندر جھاگ کی طرح سفید خرگوش کی شکل کے تھے، اسے پہنا دئے۔ بال بھی بنا دئے پھر گود میں سمیٹ لیا۔ بچہ پرسکون ہو کر سو گیا۔

کمپارٹمنٹ میں سبھی مسافر سو گئے تھے۔ رات کا آخری پہر تھا۔ سب گھر سے کھانا کھا کر چلے تھے۔

کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ کی آواز کے ساتھ گاڑی کی رفتار کم ہو گئی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ گاڑی کسی چھوٹی ندی کے پل سے گزر رہی تھی۔ نومبر ماہ کی شفاف چاندنی ٹوٹے گھڑے سے گرتی دودھ کی دھار کی طرح چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ وندھیاچل کے پیڑ اس شفاف چاندنی میں بیحد دلکش نظر آ رہے تھے۔ کہیں پانی والے بادلوں کی طرح بھورے جنگل استادہ تھے۔ کہیں لمبی شاخوں والا پیپل نیک اور ضعیف سادھو جیسا نظر آ رہا تھا۔ کہیں دوڑتے بھاگتے کتے، سب کے سب چاندنی کے سفید کینوس پر قدرت کی فنکاری کا نظارہ پیش کر رہے تھے۔

میں سویا نہیں تھا۔ خیالوں میں کھو گیا تھا۔ قدرت کے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اچانک کسی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ خیالوں کی دنیا سے باہر آیا تو میری نظر سب سے پہلے سامنے والی سیٹ پر گئی۔

بڑا لڑکا اوپر والی سیٹ پر سنگیتا کے ساتھ سو رہا تھا۔ منجھلا اور والا خود سر لڑکا باپ کے پاس سویا ہوا تھا۔ چھوٹا ماں کی گود میں نیند کے مزے لے رہا تھا۔

وہ بیٹو جتنا منھ پھاڑ سکتا تھا، اتنا پھاڑ کر کھانا کھا رہا تھا۔ بیوی بھی کھانے میں مشغول تھی۔ بچے کھا پی کر سو رہے تھے مگر سنگیتا! جب سے وہ گاڑی میں بیٹھی تھی تب سے میں نے اسے کچھ کھاتے پیتے نہیں دیکھا تھا۔ کیا اسے بھوک نہ لگی ہوگی؟ وہ بھوکی پیاسی سو گئی تھی مگر کیا بھوکی پیاسی ہونے پر وہ آرام سے سو سکتی ہے؟

اچانک میں نے سنگیتا کی ٹھنڈی سانس سنی۔ وہ یقیناً جاگ رہی تھی۔ میں نے بغور دیکھا۔ وہ ہاتھوں کے تکئے پر سر رکھے سونے کا بہانہ کرتی ہوئی درحقیقت کھانا کھاتی ہوئی اپنی پھوپھی کو تکے جا رہی تھی۔

میں سب کچھ سمجھ گیا۔ سنگیتا کے لئے میرے دل میں بے اختیار ہمدردی جاگ اٹھی اور اس کی بوا کے لئے نفرت۔ ظلم اور کمینے پن کی انتہا تھی یہ۔ بھوک سے بلبلاتے بچوں کو دیکھ کر ایک کتیا بھی اپنے حصہ کا کھانا انہیں دے دیتی ہے۔ پرندے بھی اپنے بچوں کے لئے دانا دنکا، کیڑے مکوڑے لاتے ہیں۔ خود چاہیں پیٹ نا بھریں، بچوں کو بھوکا نہیں رکھتے۔ یہ آدمی کتنا بے رحم اور ظالم ہے۔ شاید اس کے سینے میں دل ہی نہیں۔ خود لگاتار کھائے جا رہا ہے۔ مشین کی طرح منھ چل رہا ہے۔ پیٹ کی آگ اس کی بجھ ہی نہیں رہی مگر ایک لمحہ کو اسے یہ خیال نہیں آ رہا کہ بارہ سال کی وہ بچی بھوکی ہوگی۔ لعنت ہے ایسے پھوپھا پر۔ میں نے دل ہی دل میں جھنجھلاتے ہوئے اسے کوسا۔

چلو، اس بدتمیز ظالم کی بات چھوڑو مگر اس عورت کو کیا کہا جائے جو لڑکی کی پھوپھی ہے۔ عورت کا دل تازہ گھی کی مانند ملائم ہوتا ہے۔ ایسا میں نے سنا تھا مگر ہڈمبا راکشی کی طرح بڑے بڑے لقمے کھاتی ہوئی اس عورت کو اس چھوٹی بارہ سالہ لڑکی کی بھوک کا خیال نہیں آیا۔ بچوں کو فطرتاً بھوک زیادہ ستاتی ہے۔ ہر بچہ اپنے ماں باپ کی آنکھوں کا تارا ہوتا ہے۔ ہر ماں ہر لمحہ اپنے بچے کے بارے میں سوچتی ہے۔ وہ عورت اپنی خوبصورتی پر گھمنڈ کرتی ہے، اپنے شوہر کی کمائی پر عیش کرتی ہے، اپنے بچوں پر ناز کرتی ہے مگر اس لڑکی پر توجہ نہیں دیتی۔ او سنگیتا، او سنگیتا پکار کر اسے جگاتی ہے، اس سے کام کرواتی ہے مگر کھانے کے لئے پکارنے کا اسے خیال نہیں آیا۔ حد ہو گئی بے رحمی کی۔۔۔!

ان ہی خیالوں میں ڈوبتے تیرتے رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ سویرا ہوگیا، مہانگری بھساول کے قریب تھی۔ کافر مسافر جاگ چکے تھے۔ درمیانی برتھ کھول کر سب نچلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو سوئے ہوئے تھے۔ کمپارٹمنٹ میں ٹوائلٹ کی طرف جانے والے دونوں راستوں پر مسافروں کی بھیڑ ہوگئی۔ دو تین مسافر تو ٹوائلٹ کے دروازے پکڑ کر کھڑے ہوئے تھے اور بعد میں آنے والوں پر جتا رہے تھے کہ وہ ان سے پہلے ٹوائلٹ میں جانے کا حق رکھتے ہیں۔ دو تین مسافر سگریٹ کے دھوئیں کا بادل بناتے ہوئے اپنی بے چینی ظاہر کر رہے تھے۔ کچھ اپنے دانت اور ہونٹوں کے درمیان تمباکو رکھے ہوئے انہیں پہلے اندر جانے دینے کی درخواست کر رہے تھے۔ چند دبنگ عورتیں مردوں کو نظر انداز کرتی ہوئی واش بیسن میں منھ دھل رہی تھیں۔ ایسا کرنے میں وہ جس بے دردی سے پانی کا ضیاع کر رہی تھیں اس سے ڈبے کا فرش گیلا ہو رہا تھا مگر کس میں ہمت تھی ان مرد پچھاڑ عورتوں کو روکنے کی، انہیں کچھ کہنے کی۔ پورا کمپارٹمنٹ جھگی جھونپڑیوں کے آس پاس کا منظر پیش کر رہا تھا۔

سنگیتا ابھی تک سو کر نہیں اٹھی تھی۔ اسے کسی نے جگایا بھی نہیں تھا۔ ناشتہ میں رکاوٹ ہوگی شاید اس خیال سے پھوپھا پھوپھی نے اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ دونوں خود چائے پی رہے تھے۔ چھوٹا بچہ مٹھائی کھاتا ہوا کھلونے سے کھیلنے میں مگن تھا۔ منجھلا لڑکا نیچے بیٹھا ہوا بسکٹ کے ڈبے کے ساتھ انصاف کر رہا تھا۔ سب سے بڑا لڑکا ناشتہ کر چکا تھا اور اب بڑے پیار سے ماں کے بالوں میں کنگھی پھیر رہا تھا۔

بھساول اسٹیشن آ گیا۔

چائے، چائے، سانبھر، سموسہ، کچوڑی، کافی فروخت کرنے والوں کی آوازوں سے پلیٹ فارم گونجنے لگا۔ چاروں طرف شور ہونے لگا۔ کون کیا فروخت کر رہا ہے۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

دس بجے کے قریب سنگیتا نیند سے جاگی۔ گاؤں دیہاتوں میں بھوت سر پر آنے والی عورتوں کے بال جس طرح کھل کر بکھر جاتے ہیں، سنگیتا کے بال بھی اسی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں بوجھل تھیں جیسے موتی والی سیپ ادھ کھلی ہوتی ہے، ویسی۔ اس نے ادھر ادھر نظر ڈال کر چپکے سے برتھ کے کونے میں تھوک دیا۔ وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ یقیناً وہ بھوک سے بے حال تھی۔ عورت بولی،

'اری سنگیتا! اٹھتی کیوں نہیں؟ دوپہر سر پر آ گئی۔ جا، ہاتھ منھ دھو لے۔'

سردی سے سکڑتی سنگیتا نیچے اتری، پھوپھی سے منجن لے کر ٹوائلٹ کی طرف بڑھ گئی۔

اسی درمیان کھانے کا آرڈر لینے والا آ گیا۔ گھوم گھوم کر آرڈر لینے لگا۔

'کھانا کہاں دو گے؟'

'جبل پور اور کٹنی کے درمیان۔' اس نے جواب دیا۔

'کتنے بجے دو گے؟' عورت نے پوچھا۔

'آٹھ بجنے سے پہلے۔'

'دو تھالی دے دینا۔'

'ٹھیک ہے۔' اس نے ڈائری میں آرڈر نوٹ کر کے ڈائری میں برتھ نمبر لکھا اور چلا گیا۔ اسی وقت سنگیتا لوٹ آئی۔ ہاتھ منھ دھو کر اس نے بال سنوار لئے تھے اور بارش سے دھلی خوبصورت کنول کے پھول کی طرح نکھر آئی تھی۔

سنگیتا، اسے سنبھال، تیرے لئے رو رہا ہے۔ عورت نے کہا اور بچے کو سنگیتا کو تھما دیا۔ سب کچھ بھول کر سنگیتا نے مسکراتے ہوئے بچے کو گود میں لے کر پیار سے چوما اور برتھ پر بیٹھ گئی۔ عورت نے ایک پوٹلی سے میٹھے ستو اور رات کی بچی ہوئی دو تین پوریاں اسے دیں۔ سنگیتا کھانے لگی۔ اس پر بھی دونوں بچوں نے ڈاکہ ڈالا اور پوریاں چھین لیں۔ صرف ستو کھا کر سنگیتا کو صبر کرنا پڑا۔ عورت اور اس ادمی نے بچوں کو روکا نہیں بلکہ شفقت سے مسکرانے لگے جیسے بچوں نے ڈاکہ نہ ڈالا ہو، کوئی کارنامہ انجام دیا ہو۔

جبل پور نکل گیا۔ گاڑی دو گھنٹہ تاخیر سے چل رہی تھی۔ موسم سرما کی رات گہرانے لگی مگر اکثر لوگ سونا نہیں چاہ رہے تھے کیونکہ انہیں پریاگ تک ہی جانا تھا۔

سنگیتا پھر اوپر کی برتھ پر چلی گئی۔ چھوٹا لڑکا اسی کے پاس سو گیا۔ مہانگری سہورا اسٹیشن پر کھڑی ہوگئی۔ کافی دیر کھڑی رہی۔

'یہاں کیوں رک گئی گاڑی، کیا پٹری خالی نہیں ہے؟' آوازیں ابھریں۔

'پریاگ سے آنے والی مہانگری لیٹ آ رہی ہے۔' کوئی بولا۔

'نہیں نہیں، مہانگری تو جبل پور تک نکل گئی۔' کسی نے اطلاع دی۔

'ہاؤڑہ ممبئی میل کا وقت ہے بھئی۔' کسی نے کہا۔

'ٹھیک ٹھیک، وہی گاڑی ہوگی۔'

'سب لوگ اپنی اپنی لگا رہے تھے کہ جنگلی سور کی طرح دھڑدھڑاتی، خوفناک آوازیں نکالتی ہوئی ہاؤڑہ ممبئی میل تیزی سے پاس ہوگئی۔'

مہانگری آگے کے سفر پر روانہ ہوئی۔ کھانا دینے والا آ گیا۔ جنہوں نے کھانا آرڈر کیا تھا اپنی اپنی تھالیاں لے کر کھانے بیٹھ گئے۔ پیٹو پھوپھا اور اس کی بیوی آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ تھالیاں درمیان میں رکھ لیں اور شروع ہوگئے۔

سنگیتا ان دونوں کی طرف دیکھے بغیر خاموشی سے لیٹ گئی۔

□□□

بریک لینے کی روایت

ملئے جین
سیکٹرk، ایچ50، ایودھیانگر، بھوپال
موبائل: 9425465140

جولوگ صرف ٹی وی پر آنے والے کامرشیئل بریک کو ہی بریک سمجھتے ہیں، انہیں میں یہ بتانا چاہوں گا کہ بریک لینا ہماری قدیمی تہذیب رہی ہے۔ ہماری تاریخ شاہد ہے کہ ہم سندھ تہذیب کے دور ہی سے بریک لیتے آئے ہیں۔ جونا گڑھ کا سلطان محمود بیگڑا اپنے بستر کے قریب سموسوں کی پلیٹ رکھ کے سوتا تھا۔ جب جب آنکھ کھلتی، وہ سموسے کھاتا اور پھر سو جاتا تھا۔ ہمارے دفتروں کے کارکنان آج بھی اس روایت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ تمام کارکنان دفتر میں بریک لینے کے لئے کچھ دیر آنکھیں بند کرتے ہیں اور آنکھ کھلتے ہی بریک لینے کو فوراً کینٹین کی جانب رخ کرتے ہیں۔ سموسے اگر مفت میں دستیاب ہوں تو ان سموسوں کی مدارات میں وہ محمود بیگڑا کو مات دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کچھ تو نینداور سموسوں کے اس اہم ترین کام سے اچانک مورل بریک کے لئے ہی کچھ فائلوں کو آگے بڑھاتے ہیں پھر سو جاتے ہیں پھر آنکھ کھلتے ہی سموسوں کی طرف رخ کرتے ہیں۔

ہماری نوجوان نسل بھی تا دم مرگ تکئے کے نیچے کیسر کا دم رکھ کے سوتی ہے۔ متعدد قسم کی جڑی بوٹیوں سے بنی ہوئی خوراک جیبوں میں رکھی رہتی ہے جنہیں تہذیب یافتہ لوگ گٹکا کے نام سے پہچانتے ہیں۔ ہمارا نوجوان آدھی رات کو آنکھ کھلتے ہی بریک لیتا ہے۔ فوراً گٹکے کی پڑیا منھ میں انڈیلتا ہے اور پھر سو جاتا ہے۔ صبح اٹھتا ہے، منھ بعد میں دھوتا ہے، پہلے گٹکے کا رسمی بریک ضروری ہوتا ہے۔ اول گٹکا بعد میں سارے کام۔

امتحانات کے دوران بریک لینے کا کام کل ہند سطح پر انجام پاتا ہے۔ بھلے ہی کوئی بد قسمت اس کے بارے میں ریسرچ نہ کر سکا ہو

> ہماری پرانی نسل کے عظیم اور نامور شاعر ہوں یا عصر حاضر کے کولھو میں پیری ہوئی یو یو نسل، دونوں ہی چار بوتل ووڈکا کے اس دور میں الگ ہی انداز میں بریک لے رہے ہیں۔ پب اور حقا بار میں 'ساری نائٹ ہو بے شرمی کی ہائٹ، ایک میں ایک تو اور ہو ڈِم ڈِم سی لائٹ' جیسے کرشمائی اشعار کے توسط سے اسی پیرائی میں زندگی کے مسائل کا حل کھوجتی ہوئی نظر آتی ہے۔ بازار میں دھندے کی لائٹ ڈِم نہ ہو لہٰذا مینجمنٹ کے کئی امیر کارپوریٹ دفتر کام کے درمیان بریک کے لئے نیند کے انتظامات کر رہے ہیں۔ اس سے ایک قدم بڑھ کر کچھ نے تو رقص کا بندوبست کیا ہے۔ ریپ، زمبا، بھرت ناٹیم جو دل میں آئے، بھرپور رقص کرو تاکہ کارپوریٹ کے کولھو میں ایچ آر کے پیرائی مینجمنٹ پرفیکٹ ہو سکے۔ پبلک سیکٹر میں نیند کے لئے بریک لینا تو قدیم تاریخی عمل ہے لیکن نیند کے بجائے رقص جیسے بریک کے طرز کو اپنانے پر غور نہ کیا جانا فکرمندی کا سبب ہے اور سب کچھ رام بھروسے نہ چھوڑ کر خود سے بھی کچھ کرنے کی کوشش کی ضرورت ہے۔

لیکن میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جو طالب علم چوبیس گھنٹے میں چھ مرتبہ رفع حاجت کے لئے نہیں جاتا وہ تین گھنٹے کے پرچہ میں کم سے کم چھ بار رفع حاجت کے لئے نام پر بریک ضرور لیتا ہے۔ اس دوران وہ رفع حاجت پر توجہ دے یا نہ دے، بیت الخلاء کے خفیہ مقامات پر پوشیدہ طور پر رکھی ہوئی چٹوں سے حصول علم کرتا ہے اور حصول علم کے دوران بریک کے طور پر گٹکے کی پڑیا کے توسط سے بھرپور توانائی بھی حاصل کرتا ہے۔ آباء واجداد کہتے آئے ہیں کہ امتحان میں جانے سے پہلے دہی کا استعمال کرنا چاہئے وہ اس نئی نسل کے آگے نہایت کم عقل اور لکیر کے فقیر ثابت ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک چٹکی گٹکے کی قیمت اور خدائی شفقت سے یکسر انجام ہیں یہ دقیانوس بوڑھے۔

اچھے بھلے ٹریفک کے درمیان صرف بریک لینے کے لئے ہمارے ملک کے تہذیب یافتہ نوجوان بائک دوڑاتا ہوا جس ادا سے آنکھیں بند کر دانتوں سے گٹکے کا پاؤچ کھول کر منھ میں بھرتا ہے، وہ دنیا کے کسی ملک کے مائی کے لال کی بس کی بات ہی نہیں ہے۔ ہماری پکی ہوئی عمر کا چکا ہوا ادھیڑ بھی خدائی شفقت پر مکمل عقیدت کے ساتھ چلتی کار کا دروازہ کھول کر گردن زمین کی جانب لٹکا کر جس خطرناک خود اعتمادی سے پیک تھوکتا ہے، ویسا ایڈوینچر فارمولا ون کے مائیکل شوماکر کے تصور

سے بھی پرے ہے۔

ہماری پرانی نسل کے عظیم اور نامور شاعر ہوں یا عصر حاضر کے کولہو میں پیری ہوئی یو یونسل، دونوں ہی چار بوتل وودکا کے اس دور میں الگ ہی انداز میں بریک لے رہے ہیں۔ پب اور حقابار میں 'ساری نائٹ ہو بے شرمی کی ہائٹ، ایک میں ایک تو اور ہو ڈِم ڈِم سی لائٹ' جیسے کرشمائی اشعار کے توسط سے اسی پیرائی میں زندگی کے مسائل کا حل کھوجتی ہوئی نظر آتی ہے۔ بازار میں دھندے کی لائٹ ڈِم نہ ہو لہٰذا مینجمنٹ کے کئی امیر کارپوریٹ دفتر کام کے درمیان بریک کے لئے نیند کے انتظامات کر رہے ہیں۔ اس سے ایک قدم بڑھ کر کچھ نے تو رقص کا بندوبست کیا ہے۔ ریپ، زمبا، بھرت ناٹیم جو دل میں آئے، بھرپور رقص کرو تا کہ کارپوریٹ کے کولہو میں ایچ آر کے پیرائی مینجمنٹ پرفیکٹ ہو سکے۔ پبلک سیکٹر میں نیند کے لئے بریک لینا تو قدیم تاریخی عمل ہے لیکن نیند کے بجائے رقص جیسے بریک کے طرز کو اپنانے پر غور نہ کیا جانا فکرمندی کا سبب ہے اور سب کچھ رام بھروسے نہ چھوڑ کر خود سے بھی کچھ کرنے کی کوشش کی ضرورت ہے۔ گھنٹوں سے قطار میں کھڑے ہوئے پریشان حال عوام کے لئے اس سے اچھا بریک کیا ہوگا کہ جیسے ہی دفتری بریک کی گھنٹی بجے، ساری کھڑکیوں سے کارکنان اور کیبنوں کے افسر 'رمبا ہو ہو ہو، میں ناچوں، تو ناچے' پر رقص شروع کر دیں۔ عجب حیرت انگیز نظارا ہوگا۔ سب کو برابر کا بریک ملے۔ کھڑکی کے اس طرف بھی اور اس طرف بھی۔

ہماری تاریخ کا حصہ رہا ہے کہ جب راجہ اور ان کے ملازم راج کاج کی کھاج سے ایک دم پریشان ہو جاتے تھے تو بریک کے لئے شکار کھیلنے نکلتے تھے اسی طرح افسر اور ماتحت بریک کے لئے ٹور پر جاتے ہیں۔ کئی اہم لوگ تو اہم ترین بریک کی خاطر نامعلوم مقامات پر چلے جاتے ہیں۔ یہ ہماری ترقی یافتہ تکنیک اور خدائی مہربانی کی ہی بدولت ہے کہ ان سب کے بعد تمام دفتروں کا سسٹم آٹو موڈ پر چلا جاتا ہے۔

رات کی بسوں کا ڈرائیور بھی آدھی رات کو بس کو ڈھابے پر کھڑی کر کے باہر صرف بریک لینے کی خاطر نکلتا ہے تا کہ اسٹرینگ کو بھگوان کے ہاتھوں کی خاطر نامعلوم مقامات پر چلے جاتے ہیں۔ یہ ہماری ترقی یافتہ تکنیک اور خدائی مہربانی کی ہی بدولت ہے کہ ان سب کے بعد تمام دفتروں کا

بریک کی روایت کی تعلیم ہمیں اسکول ہی سے حاصل ہوئی ہے۔ ہمارے اسکول میں کرسیوں پر پیر پھیلا کر سونے کے لئے بھرتی ہونے والے اساتذہ مورل سائنس کی کلاس صرف مورل بریک کے لئے ہی پڑھاتے تھے اور درمیان میں اٹھ کر طلباء کو پیٹنے کا کام بھی محض بریک کے طور پر ہی کیا جاتا رہا ہے۔ اسکول میں سوئیٹر بننے کے لئے تنخواہ پانے والی استانیاں صرف اموشنل بریک کے لئے بارہ اٹھے چھیانوے پڑھاتی تھیں۔

سسٹم آٹو موڈ پر چلا جاتا ہے بالکل اسی طرح جیسے طویل مسافت کی ائیر لائنس کے پائلٹ ہزاروں فٹ کی بلندی پر صرف بریک لینے کے لئے جہاز کو آٹو موڈ میں چھوڑ کر لمبی تان دیتا ہے اور بھگوان کا کاک پٹ میں بیٹھا مسافروں کے جان مال کی رکھوالی کرتا ہے۔

ہماری تاریخ کا حصہ رہا ہے کہ جب راجہ اور ان کے ملازم راج کاج کی کھاج سے ایک دم پریشان ہو جاتے تھے تو بریک کے لئے شکار کھیلنے نکلتے تھے اسی طرح افسر اور ماتحت بریک کے لئے ٹور پر جاتے ہیں۔ کئی اہم لوگ تو اہم ترین بریک کی خاطر نامعلوم مقامات پر چلے جاتے ہیں۔ یہ ہماری ترقی یافتہ تکنیک اور خدائی مہربانی کی ہی بدولت ہے کہ ان سب کے بعد تمام دفتروں کا سسٹم آٹو موڈ پر چلا جاتا ہے۔

رات کی بسوں کا ڈرائیور بھی آدھی رات کو بس کو ڈھابے پر کھڑی کر کے باہر صرف بریک لینے کی خاطر نکلتا ہے تا کہ اسٹرینگ کو بھگوان کے ہاتھوں میں تھما کر آنے والے سفر کو بغیر بریک کے مکمل کر سکے اور مسافر بھی بغیر بریک منزل مقصود تک پہنچ سکیں۔

بریک کی روایت کی تعلیم ہمیں اسکول ہی سے حاصل ہوئی ہے۔ ہمارے اسکول میں کرسیوں پر پیر پھیلا کر سونے کے لئے بھرتی ہونے والے اساتذہ مورل سائنس کی کلاس صرف مورل بریک کے لئے ہی پڑھاتے تھے اور درمیان میں اٹھ کر طلباء کو پیٹنے کا کام بھی محض بریک کے طور پر ہی کیا جاتا رہا ہے۔ اسکول میں سوئیٹر بننے کے لئے تنخواہ پانے والی استانیاں صرف اموشنل بریک کے لئے بارہ اٹھے چھیانوے پڑھاتی تھیں۔ اب جب کہ زمانہ بدل گیا ہے اور بازار نے بنائی رسم اور میڈیا نے پٹائی رسم کا خاتمہ کر دیا ہے تو یہ سوشل میڈیا پر مختلف پوسٹ کی رسم کو بریک لیتے ہوئے تعلیم و تعلم جیسی عظیم خدمت انجام دے رہے ہیں۔ سوشل میڈیا نے تعلیم کے میدان ہی میں نہیں بلکہ مذہب سے لے کر اقتصادیات تک اور کام سے لے کر فرصت تک جب دل چاہے، جیسا دل چاہے، بریک لینے کے حیرت انگیز مواقع فراہم کئے ہیں۔

اس طرح بریک لینا ہماری روایت کا جزو لاینفک رہا ہے۔ قومی شاعر کا قول کہ 'ہم کیا تھے کیا ہو گئے اور کیا ہوں گے ابھی' مگر کچھ معنوں میں دیکھا جائے تو سچ یہ ہے کہ ہم کچھ بھی نہیں بدلے۔ ہم تو جو تھے وہی ہیں اور وہی رہیں گے۔ ہم بریک لیتے تھے، لیتے ہیں اور آگے بھی سینہ تان کر بریک لیں گے۔ ہمارے ملک کے نوجوانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس میدان میں نئے امکانات تلاش کرتے رہیں اور ہاں تلاش و جستجو کے درمیان بریک بھی ضرور لیتے رہیں کیونکہ بھگوان تب تک تو ساتھ ہے ہی جب تک انسان خود بریک پر نہ چلا جائے۔

□□□

آپ کے خطوط

'نیا دور' کے جون ماہ کے شمارے میں اس بار کے اداریے میں جریدہ کی طویل تاریخ کو مختصراً جس طرح سے نشان زد کیا گیا ہے، وہ فقط آپ کا ہی حصہ ممکن ہوسکتا تھا۔اس کے بعد پہلے تینوں مضامین اعلیٰ و ارفع ہیں۔جناب اقبال مجید کے افسانے 'اپنے اپنے طوطے' میں ظالم ہیرو اقتدار عالم کے توسط سے موجودہ سماجی ، بالخصوص ناظموں کے ناجائز اقتدار کے معاشرے پر تسلط کی بخوبی خط کشی قابل دید و داد ہے۔ مستزاد، اگرچہ کلایمکس میں ہیرو کی بطور ایک والد ہو یدا شفقت کی گویا مسابقت بہ آسانی ہمارے گلے سے تو نہیں اُترتی ہے، تاہم یہ افسانہ کلی طور پر قنوطیت آمیزی سے امید پرستی کی جانب مبذول ہونے کے جمع نقطہ (Plus Point) سے مزین ہونے کے ہی موجب اپنے فنی گراف کو ارفع کرتا ہے

انیس رفیع صاحب کا افسانہ 'ایک اور برزخ' ہمیں بموجب ایک ہندو اساطیری داستان 'ترِ شنکو' نام کے اس کردار کی یاد دہانی کراتا ہے، جو ایک جنّتی دیوتا اور رِشی دونوں کے شاپوں کے نتیجتاً زمین اور آسمان کے مابین لٹکتا ہی رہ جاتا ہے۔فنتاسی کی ہیئت میں تحریر کردہ یہ افسانہ عوام الناس کی ذہنیت و نام نہاد تہذیب پر بھی ایک مہذب چھینٹا کشی سے عبارت کیا جا سکتا ہے۔آج کے ہمعصر دَور کے متضاد حالات میں بالآخر 'اشرف المخلوقات' انسان بھی بسا اوقات ایک ایسے عالم میں پہنچ جایا کرتا ہے، جب وہ اصلاً ہندی فلم 'داستان' کے نغمے کے مکھڑے کے ہی مطابق ''نہ تو زمیں کے لیے ہے ، نہ آسماں کے لیے/ تیرا وجود ہے یہاں داستاں کے لیے۔'' پر صادق ہونے لگتا ہے۔دھوبی کے کتے سے وابستہ ضرب المثل یا پھر اولالذکر اساطیری داستان کے بموجب جس طرح سے صادق آنے لگتا ہے،اسی کی جاندار و شاندار تصدیق کرنا ہی اس افسانے کا اہم موضوع مانا جا سکتا ہے۔

جناب خورشید حیات کے افسانے 'سورج ابھی جاگ رہا ہے' کے عنوان کے بھی بموجب بیدار آفتاب رجائیت یا امید پرستی کے مطلوب جذبے کا غماز ہے۔اصل میں انسان کبھی بھی مر نہیں سکتا ہے۔فلمی اور بلاک بسٹر سیریلوں کے مختلف الصفات تشخص جناب رامانند ساگر کے ہند پاک تقسیم اور اندوہناک فسادات پر مبنی شہرۂ آفاق اردو ناول ' اور انسان مر گیا'' کے تبصرے میں بھی خواجہ احمد عباس نے ناول کی تعریفوں کے پل باندھنے کے باوصف اتنا ضرور جوڑ دیا تھا کہ ''ناول نگار کو اس ناول کے عنوان کے بعد ایک سوالیہ نشان ضرور نصب کر دینا چاہئے تھا، کیونکہ انسان کبھی بھی مر نہیں سکتا ہے''۔

متذکرہ بالا افسانے کے تحت سائنسی و طبی معلومات کا جو بے بہا ذخیرہ جمع کیا گیا ہے، وہ ہمیں افسانہ نگار کے ایک ناول نگار کی خصوصیات سے بھی مملو ہونے کی چغلی تو کھاتا ہی ہے، مستزاد ہمیں اس کے عمیق و دقیق علم و فن کا بھی گرویدہ بنانے کے لیے کافی ہے۔کلی طور پر یہ ایک کتاب صفت شمارہ بھی حسب سابق اپنے پہلے سے تعمیر کردہ معیار پر کھرا اور پورا اترتا ہے۔

'نیا دور' کے جولائی ماہ کا شمارہ بوقلموں ہلکے سلیٹی رنگوں سے مزین منظر عام پر ظہور پذیر ہوا ہے۔مرحوم شہرۂ آفاق شاعر منور رانا کو شعری نثر لکھنے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔انکے قریبی دوست و بلند پایہ ادیب و شاعر انور جلال پوری کے فقط بطور ایک ناظم مشاعرہ انکی موقر شاعری قطعی کم نہیں ہوتی ہے ، اسکی واحد مثال اسی شمارے میں انکے محولہ متعدد اشعار سے دستیاب ہو جاتی ہے۔انکی بابت منور صاحب کا تمام تجزیہ صد فی صد صحیح ہے۔شمارے میں انور صاحب پر مبنی دیگر ہر ایک مقالہ ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔کلی طور پر یہ شمارہ انور جلالپوری کے تئیں ایک مناسب و موزوں خراج تحسین ثابت ہوتا ہے۔

مرزا جعفر حسین کا مضمون 'تعلیم و تربیت اطفال' بھی بلند پایہ ہے اور مزید مدیر صاحب کے حسنِ انتخاب و ذوقِ سلیم کا ثبوت ہے، کیونکہ اس مقالے کے فوراً بعد ہی ہندی کی مشہور و معروف ادیبہ و افسانہ نگارہ کشما شرما کا افسانہ نفس اطفال سے وابستہ ہے۔انکے نام کی غلط اشاعت کی بابت میرا خاص اعتراض یہ ہے کہ سنسکرت زبان میں 'کشما' (Kshma) فی الاصل لفظ معافی یا معذرت کے معنی میں مستعمل ہوا کرتا ہے۔ انکے اس نام کو عوامی پوربی بولی میں منتقل کر کے 'چھما' لکھنا یکسر اُسی طرح سے غلط ہے، جس طرح کسی کے نام 'بھومی' کو عوامی زبان میں 'بھوئیں' یا پھر 'زمین وا' لکھ دینا نا مناسب ہے۔اس ایک استثنا سے بعید یہ افسانہ نفسیات اطفال کا خوبصورت مرقع ہے۔چھ سال ایک خاص بچے کی خصلت و جبلت کو حقیقت کے آئینے میں منعکس کر دینے کے بموجب یہ ایک متنوع اور امر تخلیق ہونے کا درجہ رکھتی ہے۔اس افسانے میں کمپیوٹر کی تکنیک وغیرہ سے محیط ماحول و احساسات کی ترجمانی قابل دید و داد ہے۔ہیرو چھ سالہ بچے کی تمام تر خواہشات و مشاہدات کا موزوں مظہر اسکا چاند ستاروں والا عنوان ٹھہرتا ہے۔

سندھی زبان کے مقبول و معروف ادیب جناب واسدیو موہی کا افسانہ 'لاٹری' خود کلامی کی ہیئت میں تحریر ہے۔فطرت کی سطح پر ایمانداری بھی بسا اوقات کسی عورت (مثلاً افسانے میں جمیلہ) یا مرد کے تئیں کسی 'لاٹری' (عنوان) سے ہرگز کمتر نہیں ہوا کرتی ہے۔یہ خداداد بخشش کسی کسی کے نصیب میں ہی نصیب ہوا کرتی ہے۔سادہ سلیقے سے رقم یہ تحریر ایک افسانہ کم اور حیات کا ایک صاف و شفاف حقیقی ٹکڑا کہیں زیادہ نظر آتا ہے۔کلی طور پر یہ شمارہ بھی پہلے سے قائم شدہ معیار پر کھرا اور پورا اُترتا ہے۔

ڈاکٹر کرشن بھاوک

کوٹھی نمبر ۲۰۱، گرونانک نگر، پٹیالہ (پنجاب)

'نیا دور' تر و تازگی کے ساتھ اردو ادب کی خدمت میں کوشاں

اتر پردیش حکومت کی جانب سے نکلنے والا رسالہ 'نیا دور' دھیرے دھیرے اپنے سو سال پورے کرنے والا ہے۔ ۹۶ سال کی طولانی عمر کے باوجود نیا دور بڑھوتی کے بجائے جوانی کی طرف گامزن ہے ۔مضامین ، افسانے کہانیاں ،نظموں اور غزلوں کے بہترین انتخاب کی وجہ سے نیا دور کو ہمیشہ ایک منفرد ادبی میگزین تسلیم کیا گیا۔

کافی عرصہ سے نیا دور میرے پاس آتا ہے۔ کبھی کبھی میرا کوئی افسانہ یا مضمون بھی اس محترم اور معتبر رسالہ میں شائع ہوجاتا ہے۔ سید امجد حسین ،شاہ نواز قریشی ،اور ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی کی ادارت میں نیا دور نے کافی ترقی کی ۔ بہترین مضامین کے ساتھ خصوصی شماروں نے نیا دور کی مقبولیت کو آسمان پر پہنچا دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ نیا دور کے پاس اب کچھ نیا کر نے کے لیے باقی نہیں ہے۔لیکن سہیل وحید صاحب کی ادارت میں جس شکل میں نیا دور دیکھنے کو مل رہا ہے اسکی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے ۔مضامین ، کہانیاں افسانے اور غزلوں کا معیار اپنی جگہ ہے ۔ اردو کے ادیبوں اور شعرائے کرام کی تاریخ پیدائش مع تصاویر کے شائع کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا گیا ہے وہ اردو کے پرستاروں کے لیے ایک سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مشہور و معروف شعرائے کرام کے اشعار سبھی کو یاد رہتے ہیں لیکن شکل سے دنیا ناواقف ہے۔ کس سن میں پیدا ہوے اسکی معلومات بھی نہیں رہتی تھی۔ اب نیا دور نے ادیب اور شعراء کرام کو شناخت دیدی ہے۔ نیا دور کے البم نے اب اس رسالہ کے ہر شمارے کو محفوظ کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

نیا دور کے کاغذ کی کوالٹی بھی بہترین ہے۔اس کے لیے ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ اتر پریش ڈاکٹر اجول کمار شکریہ کے ساتھ مبارکباد کے مستحق ہیں ۔اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جنکی سرپرستی میں نیا دور شائع ہوتا ہے ۔ یوگی جی نے نیا دور کی بہترین اشاعت کرا کے اس غلط فہمی کو دور کر دیا کہ بی جے پی حکومت میں اردو زبان کے ساتھ کسی طرح کی نہ انصافی ہوتی ہے۔

منظر مہدی

صدر اردو پریس ایسوسی ایشن، فیض آباد

ڈاک کی بدعنوانیوں کے سبب نیا دور کا مستقل خریدار نہیں رہا۔ اب نیا دور کی یافت کے لئے 'راعی بک ڈپو، الہ آباد' کا مرہون منت ہوں۔

نیا دور مئی ۲۰۱۸ء کا شمارہ زیر نظر ہے۔ اس کا رنگ روپ دیکھ کر حیرت زدہ ہوں کہ بے تحاشہ کلیم عاجز کا ایک مصرعہ ذہن میں آ گیا جس کو حسب حال بنا کر یوں لکھ رہا ہوں کہ 'تم رسالہ نکالو ہو کہ کرامات کرو ہو' (تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو)

طباعت، مضامین، مواد، خوش نمائی، ہر اعتبار سے معیاری ہے اور مشمولات انوکھے انداز سے مزین ہیں جو مدیر کی فنکارانہ حسن کاری اور صلاحیت پر دال ہیں۔

شمارے میں سلام بن رزاق کا افسانہ 'نارد نے کہا' استعاراتی فن کا نادر نمونہ ہے۔ عصر حاضر کے ہندی کے معروف ادیب و ناول نگار امر کانت کی کہانی 'دوپہر کا کھانا' مطالعہ کی چیز ہے۔ اردو شاعری میں اپنی منفرد شناخت رکھنے والی شاعرہ 'ساجدہ زیدی' اور افتخار امام صدیقی، مناظر عاشق ہرگانوی کی غزلیں غزلیت کو وقار عطا کرتی ہیں۔ علاوہ ازایں کہنہ مشق انشاء پرداز مرزا جعفر حسین کا مضمون 'تعیش بے تحاشا کا یہی انجام ہونا تھا' نوابین اودھ کی تہذیب وثقافت کا نادر ترجمان ہے۔

مجموعی طور پر رسالہ ایک معیاری رسالہ کی خوبیوں سے مزین ہے۔ بلا شبہ مدیر نیا دور اور جملہ اراکین قابل مبارکباد ہیں کہ نیا دور کو نئے دور سے ہم کنار کر کے ایک اضافے کی حیثیت عطا کر دی ہے۔

سید علی حیدر رضوی

سی ایم پی ڈگری کالج، الہ آباد

جولائی ۲۰۱۸ء کا شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ نیا دور واقعی ایک قابل تعریف رسالہ ہے۔ اس کے تمام مضامین مجھے بیحد پسند آتے ہیں۔ یوں بھی یہ رسالہ خاندان کے ہر فرد کے لئے ہے۔ سورج کے سامنے چراغ کی کیا ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماہنامہ نیا دور کی تعریف کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اس ماہ کے سبھی مضامین، اداریہ، غزلیں، گوشۂ انور جلالپوری، غیر ملکی ادب، لاٹری، ہندوستانی زبانیں، سندھی کہانی، گل افشانیاں، مصطفی علی، انتخاب غرض کہ سب کچھ پسند آیا۔

پیرزادہ محراج الدین

سلر، پہلگام (کشمیر)

جولائی ۲۰۱۸ء کا شمارہ موصول ہوا۔ رسالہ کے آغاز ہی میں انور جلالپوری پر ایک بہترین گوشہ دیکھ کر دل خوش ہوا۔ گوشہ میں ابتدا کی دونوں غزلیں بہترین ہیں۔ منور رانا نے بے باک انداز میں بہترین تحریر پیش کی ہے۔ آصفہ زمانی، سلمیٰ حجاب، خوشبیر سنگھ شاد، امین احسن، شفیع ایوب، سنجئے مصرا شوق وغیرہ کے مضامین بھی انور صاحب کو بہترین خراج عقیدت ہیں۔

اس کے علاوہ شمارے میں شامل دیگر کہانیاں، افسانے، مزاحیہ اور بازدید وغیرہ بھی مطالعہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ مرزا جعفر حسین کا مضمون نوابین اودھ کے دور کی بہترین عکاسی ہے۔ امید ہے کہ یہ سلسلہ ایسی ہے جاری رہے گا۔

عون محمد

جلالپور، امبیڈکر نگر

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی جھولے لال پارک، لکھنؤ میں
سابق وزیر اعظم آنجہانی اٹل بہاری واجپئی کے سوگ میں منعقد
تعزیتی جلسے کو خطاب کرتے ہوئے

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک جھولے لال پارک، لکھنؤ میں
سابق وزیر اعظم آنجہانی اٹل بہاری واجپئی کے سوگ میں
منعقد تعزیتی جلسے کو خطاب کرتے ہوئے

مرکزی وزیر داخلہ جناب راج ناتھ سنگھ جھولے لال پارک، لکھنؤ میں
سابق وزیر اعظم آنجہانی اٹل بہاری واجپئی کے سوگ میں منعقد پروگرام میں
استھی کلش پر گلہائے عقیدت پیش کرتے ہوئے

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی جھولے لال پارک، لکھنؤ میں
سابق وزیر اعظم آنجہانی اٹل بہاری واجپئی کے سوگ میں منعقد پروگرام میں
استھی کلش پر گلہائے عقیدت پیش کرتے ہوئے

نائب وزیر اعلیٰ جناب کیشو پرساد موریہ جھولے لال پارک، لکھنؤ میں
سابق وزیر اعظم آنجہانی اٹل بہاری واجپئی کے سوگ میں منعقد پروگرام میں
استھی کلش پر گلہائے عقیدت پیش کرتے ہوئے

محترمہ نمتا بھٹاچاریہ، مرکزی وزیر داخلہ جناب راج ناتھ سنگھ، اتر پردیش کے گورنر
جناب رام نائیک اور وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی، جھولے لال پارک، لکھنؤ میں
سابق وزیر اعظم آنجہانی اٹل بہاری واجپئی کی 'استھی وسرجن' کے موقع پر

محترمہ نمتا بھٹاچاریہ جھولے لال پارک، لکھنؤ میں
سابق وزیر اعظم آنجہانی اٹل بہاری واجپئی کے سوگ میں منعقد پروگرام میں
استھی کلش پر گلہائے عقیدت پیش کرتے ہوئے

شیعہ عالم دین مولانا کلب جواد سابق وزیر اعظم آنجہانی اٹل بہاری واجپئی
کے سوگ میں منعقد تعزیتی جلسے کو خطاب کرتے ہوئے

उर्दू मासिक
नया दौर
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

مرکزی وزیر داخلہ جناب راج ناتھ سنگھ، اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک، وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی، نائب وزیر اعلیٰ جناب کیشو پرساد موریہ
اور دیگر معززین جھولے پارک، لکھنؤ میں 'استھی وسرجن' کے موقع پر سابق وزیر اعظم آنجہانی اٹل بہاری واجپئی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے (۲۳/اگست ۲۰۱۸ء)

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی نئی دہلی میں
سابق وزیر اعظم آنجہانی اٹل بہاری واجپئی کے جسد خاکی پر گلہائے عقیدت پیش کرتے ہوئے (۱۷/اگست ۲۰۱۸ء)

نیا دور کے شمارے اب A.H. Wheeler لکھنؤ کے سبھی بک اسٹالوں پر بھی دستیاب ہیں

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

वर्ष : 73 अंक 04
अगस्त 2018
मूल्य : 15 रु./–
वार्षिक मूल्य : 165 रु./–

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006–08
ISSN 0548-0663

प्रकाशक व मुद्रक, MkO mTToy dqekj] निदेशक द्वारा सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. के लिए प्रकाश पैकेजर्स, 257 गोलागंज, लखनऊ से मुद्रित एवं प्रकाशन प्रभाग, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र., सूचना भवन, पार्क रोड, लखनऊ–226001 से प्रकाशित–सम्पादक, **सुहेल वहीद**